www.urducouncil.nic.in

فروری 2020، قیمت :- ₹10

ماھنامہ

بچوں کی دنیا

نئی دہلی

قومی یوم سائنس

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ اُردو دُنیا

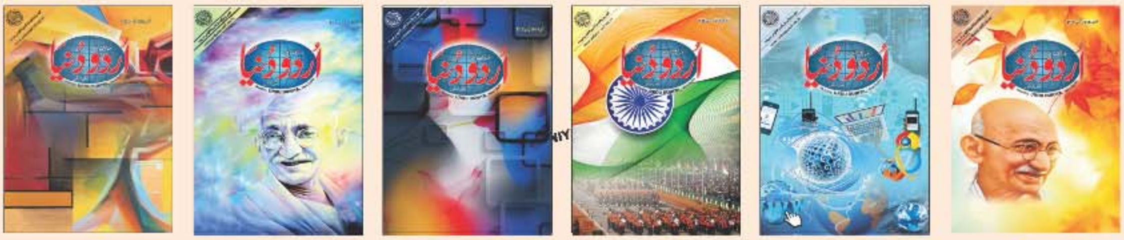

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھیے، اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیش کش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066، فون: 26109746، فیکس: 26108159

E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

بچوں کی دنیا

جلد:8 شمارہ:02 فروری 2020

مدیر: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل۔ محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی -110025
فون:49539000
شعبہ ادارت:11-49539009

ای میل
bachonkiduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: /10 روپے، سالانہ /100 روپے

▪ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبہ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت

ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم
نئی دہلی - 110066
فون:26109746

ای میل:sales@ncpul.in
ncpulsaleunit@gmail.com

علاقائی مرکز: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، چھتہ بازار، حیدرآباد - 500002
فون: 040-24415194

اس شمارے میں

مدیر کا خط	آپس کی باتیں		04
بڑوں کی باتیں	ڈاک خانہ		05
قومی یوم سائنس	پیغام	اے پی جے عبدالکلام	06
	خالق کی رحمت	اے پی جے عبدالکلام	07
	زندگی میں سائنس	اندرجیت لال	09
	چندر شیکھر وینکٹ رمن	عظیم اقبال	12
	رمن ایفیکٹ اور سی وی رمن	شفیع ایوب	15
	بابائے میزائل	شجاع الدین شاہد	18
	نئے عہد کے روبوٹ	مقبول احمد سراج	20
	پروفیسر ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹنا گر	احرار حسین	23
	اے ٹی ایم	نسیم سعید	26
	سائنس کے میدان میں.....	مہروز فاطمہ	30
نظمیں	آپ اگر بن جائیں قابل	سید بشیر احمد بشیر سولا پوری	32
	دادا کی پوتی	محمد رفیع انصاری	32
	گفتگو جموڑے سے	مہدی پرتاپ گڑھی	33
سیر کر دنیا کی	تھائی لینڈ کے سفر کا دلچسپ قصہ	طارق محمود مرزا	34
کیریئر /مضمون	آثارِ قدیمہ کے میدان میں کیریئر	مومن فہیم احمد عبدالباری	39
کہانی	بگ بین کے اسرار	نصر ملک	42
صحت و تندرستی	فاسٹ فوڈ	اسما انصاری	44
اردو کا جادو	اردو زبان کا جادو	ادارہ	47
باتصویر کہانی	انسانیت	انیس اعظمی	48
قسط وار ناول	آدتیہ سمندری لڑکا	انیتا سرن	52
کہکشاں	ہمارا پیارا ملک	طربیہ حیات بنت شمشاد احمد	57
	اقوالِ زرّیں	قاضی مسیرہ ناز نوید اقبال	58
	سوچھ بھارت ابھیان	قمرالدین معین الدین شیخ	58
ننھے فنکار	پیاسی چڑیا	مجاہد الرحمن	60
	بچوں کی پینٹنگ		61

آپس کی باتیں

پیارے دوستو! قومی یوم سائنس پر 'بچوں کی دنیا' کا خصوصی شمارہ پیش ہے۔ آپ سب کو معلوم ہوگا کہ ہمیں آج کی دنیا میں جتنی آسائشیں اور سہولتیں میسر ہیں ان میں سائنس کا رول بہت اہم ہے۔ سائنسی ایجادات نہ ہوتیں تو شاید ہمارے لیے زندگی اتنی آسان نہ ہوتی۔ ہمیں اپنے سائنس دانوں کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے ہماری سہولیات کے لیے رات دن محنت کر کے بہت ساری چیزیں ایجاد کیں۔ ہمارے ملک ہندوستان کے سائنس دانوں نے بھی دنیا کو بہت سی نادر و نایاب چیزیں دی ہیں۔

ہمارے ملک میں سائنس دانوں کی ایک اچھی خاصی فہرست ہے جنھوں نے سائنس کے میدان میں ترقی کا پرچم لہرایا ہے ان میں ایک بڑا نام ڈاکٹر چندر شیکھر وینکٹ رمن کا ہے۔ انھوں نے 28 فروری 1928 کو رمن ایفکٹ کی تلاش کی تھی اور بطور ہندوستانی انھیں سائنس کے نوبل انعام سے نوازا گیا تھا۔ اسی لیے اس دن کو قومی یوم سائنس کے طور پر منایا جاتا ہے۔

سر سی وی رمن کے علاوہ ہمارے ملک کے نامور سائنس دانوں میں جگدیش چندر بوس، ہومی جہانگیر بھابھا، وکرم سارا بھائی، ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام، ستیندر ناتھ بوس، ڈاکٹر سالم علی، میگھناد ساہا، سبرمنین چندر شیکھر، پرفل چندر رائے، ڈاکٹر سید ظہور قاسم، پروفیسر ای اے صدیق، ڈاکٹر عبید صدیقی، ڈاکٹر شمیم جیراج پوری اور ڈاکٹر احتشام حسنین جیسے سائنس دانوں نے ہمارے ملک کے لیے بڑی اہم خدمات انجام دی ہیں۔

آج ہماری زندگی میں سائنس کا دور دورہ ہے۔ سائنس نے بیماری سے لڑنے کے لیے کئی اہم ایجادات دنیا کو دی ہیں۔ چلنے پھرنے اور حمل و نقل کے نئے نئے طریقے سائنس کے مرہون منت ہیں۔ سائنس نے دنیا کو گلوبل ولیج میں تبدیل کر دیا ہے اور ہزاروں کلومیٹر کے فاصلے کو کم کر دیا ہے۔ آج یہ سائنس کا ہی کرشمہ ہے کہ انسان سمندروں میں اور زمین کی تہوں میں دنیا بسا رہا ہے، وہیں دوسری طرف چاند اور مریخ کو فتح کیا جا رہا ہے۔ ہمارے موجودہ وزیر اعظم عزت مآب نریندر مودی بھی سائنس کی اہمیت کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ انھوں نے 25 فروری 2018 کو اپنے مقبول پروگرام 'من کی بات' میں کہا تھا کہ:

''سائنس اور ٹکنالوجی کی قدر غیر جانب دار ہوتی ہے۔ ان میں قدر و قیمت خود بخود نہیں ہوتی۔ کوئی بھی ٹکنالوجی ویسے ہی کام کرے گی جیسے ہم چاہیں گے لیکن یہ ہمارے اوپر منحصر ہے کہ ہم مشین سے کیا کام لینا چاہتے ہیں۔ یہاں انسانی مقاصد اہم ہو جاتے ہیں۔ سائنس کا انسانی پہلو فلاح و بہبود کے لیے، انسانی زندگی کی بلند ترین اونچائیوں کو چھونے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔''

'بچوں کی دنیا' کے اس شمارے میں قومی یوم سائنس کی مناسبت سے کچھ تحریریں پیش کی جا رہی ہیں تاکہ 'بچوں کی دنیا' کے قارئین میں سائنسی فکر بیدار ہو کیونکہ اب بھی کائنات کے بہت سے راز پوشیدہ ہیں اور وہ آپ جیسے کسی سائنسی ذہن و فکر والے کا انتظار کر رہے ہیں کہ آؤ مجھے تلاش کرو اور فتح کرو۔

ماہ فروری کی 21 تاریخ کو عالمی یوم مادری زبان کے طور پر منایا جاتا ہے اور ہم سب کی مادری زبان اردو ہے اس لیے ہمیں اپنی زبان اردو کا چلن عام کرنا چاہیے اور اپنی زبان سے محبت کا ثبوت پیش کرنا چاہیے۔

اب آپ 'بچوں کی دنیا' کا مطالعہ کریں اور اپنے تاثرات اور مشوروں سے ہمیں ضرور آگاہ کریں۔

آپ کا

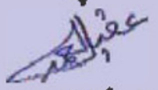

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاک خانہ

'بچوں کی دنیا' ستمبر 2019 بصد شکریہ وصول ہوا۔ اس شمارے میں 'یومِ اساتذہ' اور 'چندریان2' کی اہمیت جتائی گئی ہے۔ یومِ اساتذہ اس اعتبار سے کہ اس ماہ میں سروپلّی ڈاکٹر رادھا کرشنن پیدا ہوئے تھے۔ انہی کے یوم پیدائش کو ہم بطور یوم اساتذہ مناتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہمارے اساتذہ ہی ہونہار طلبہ کو پڑھا لکھا کر بڑے بڑے سائنسداں بناتے ہیں اور انہی کی محنت سے ہم آج چندریان 2 کو چاند کے جنوبی حصے میں بھیجنے کے قابل ہوئے ہیں۔ اس بارے میں اچھے مضامین شامل ہیں۔ یوم اساتذہ پر بھی اچھے مضامین لکھے گئے ہیں، لیکن 'ایک منٹ کا پرچہ' (ص17) دلچسپ لگا۔ باقی تمام مشمولات بہت ہی پیارے اور دلچسپ ہیں۔ خصوصاً قسط وار کہانی 'بے زبان ساتھی' تو بہت ہی دلچسپ ہے۔ یعنی اس شمارے میں علم و عمل، کھیل کود، ہنسی مذاق سب کچھ سموئے ہوئے ہیں۔ بس پڑھتے رہیے اور جھومتے رہیے۔

مصطفیٰ ندیم خان غوری، روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

'بچوں کی دنیا' پابندی سے پڑھتی ہوں۔ بہت دلچسپ اور معلوماتی رسالہ ہے۔ کاش کہ ایسا خوبصورت اور جاندار رسالہ ہمیں اپنے بچپن میں نصیب ہوا ہوتا۔

ڈاکٹر صبیحہ انور، نامی پریس بلڈنگ، خواجہ قطب الدین روڈ، لکھنؤ، یوپی

'بچوں کی دنیا' جولائی 2019 کا شمارہ ملا۔ پڑھ کر کافی مسرت ہوئی، تمام مضامین بہت عمدہ تھے، خاص طور پر 'کیڑوں کی دنیا' بہت اچھا لگا۔ اس سے کیڑوں کے بارے میں کافی باتیں جاننے کو ملیں اور ان عجیب و غریب مخلوق کی وجہ سے اللہ رب العزت کی قدرت پر یقین مزید پختہ اور مستحکم ہو گیا، فاضلہ الفت کا مضمون 'میری امی جان' بھی کافی دلچسپ ہے۔ اس رسالے کے سبھی کالموں کا اپنا ہی انداز ہے، سبھی ایک سے بڑھ کر ایک ہیں اور یہی وہ چیز ہے جو 'بچوں کی دنیا' کو دوسرے رسالوں سے ممتاز کرتی ہے، اتنا خوبصورت رسالہ شائع کرنے اور اردو زبان کو فروغ دینے کے لیے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

محفوظ الرحمٰن، حمید پورا، متوناتھ بھنجن، یوپی

بلاشبہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بچوں کا محبوب رسالہ 'بچوں کی دنیا' ملک کے ہر خطے میں بے حد مقبول ہو چکا ہے۔ خوبصورت اور رنگین صفحات سے مزین رسالہ نے اردو رسالوں کی اشاعت کا ایک اعلیٰ معیار قائم کیا ہے، اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

احمد مشکور، سابق ایڈیٹر ماہنامہ 'ثانی' لکھنؤ

قومی یوم سائنس

پیغام

لفظ!

تیرے پانی سے
پیاس بجھ نہیں سکتی
صرف فارمولے ہی
کشتیوں کو دریا میں
بھی چلا نہیں پاتے
حرف و لفظ کی بارش
تر زمیں نہیں کرتی

حسرت و تمنا سے
ذہن و روح پر لیکن
روک لگ بھی سکتی ہے
ہاں اگر اُسے اپنی—
ذات پر بھروسہ ہو
تب یہ داخلی قوت

آگ بن کے جلتی ہے
اور جھنجھوڑ دیتی ہے
تار روح کے سارے
ارتعاش ہوتا ہے
گونج کہنے لگتی ہے
رکھ تلاش حق جاری
اپنی ذات کے اندر
خالص اور پاکیزہ
جیسے اک رواں چشمہ
عکس حق وہ ابھرے گا
جس طرح تو سوچے گا

خود پہ گر بھروسہ ہے
ذات خود کی اگر تکریم
پختگی عقیدے کی

راہ اسے ہٹا دے گی
یہ رکاوٹیں ساری
ہمیشہ سے مالک نے ہر بشر نوازا ہے
سب کے سب برابر ہیں
زندگی پہ حق سب کا
چاہ سب کی آزادی
آرزو مسرت کی
راز کامیابی کا
اعتماد خوابوں پر
اپنے کام سے الفت
کون چھین سکتا ہے
تیرے خواب زاروں کو

■

مرحوم ڈاکٹر ابوالفاخر زین العابدین عبدالکلام
بحوالہ: میرا سفر (شعری مجموعہ)، مترجم: شکیل شفائی، سنہ اشاعت: 2004

اے پی جے عبدالکلام

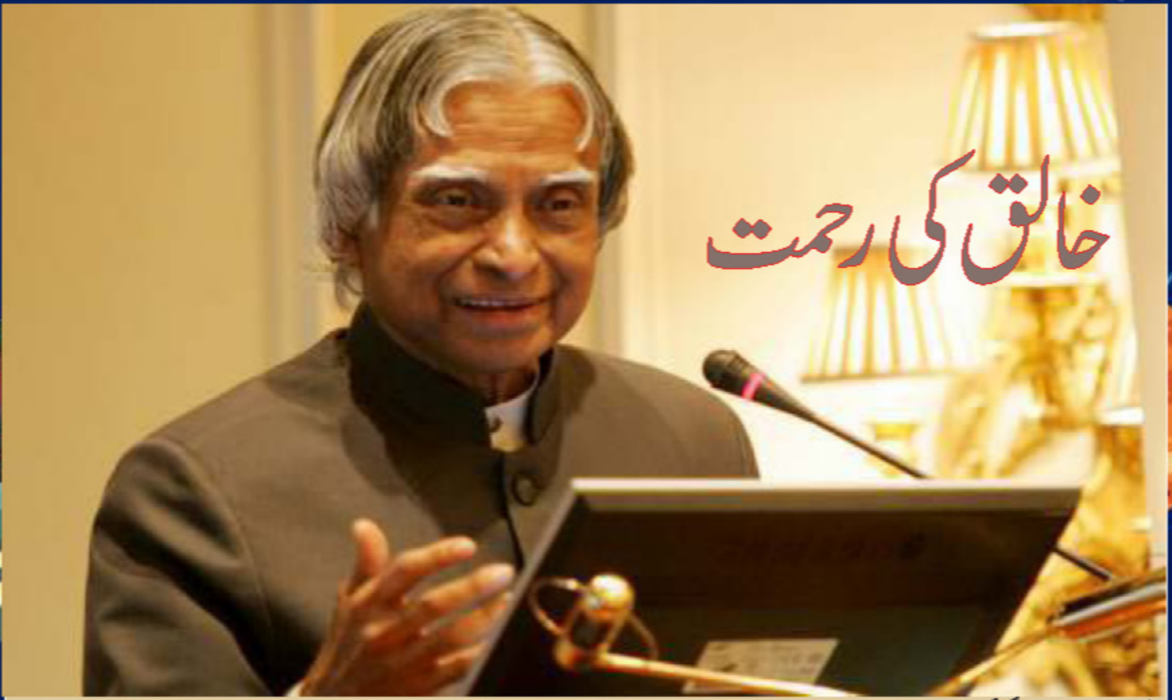

خالق کی رحمت

اطمینان سے زندگی گزار سکے۔ انتخاب کرنے اور اپنی قسمت کو بنانے میں ہمارا راستہ مختلف ہوتا ہے۔ زندگی ایک مشکل کھیل ہے۔ اپنے انسان ہونے کے پیدائشی حق کو اپنے تصرف (قبضہ، اختیار) میں رکھتے ہوئے تم اسے جیت سکتے ہو۔ اس حق کی حفاظت میں تمھیں ان معاشرتی اور بیرونی خطرات کو مول لینا پڑے گا جو دباؤ کو نظرانداز کرنے میں مضمر (پوشیدہ) ہوتے ہیں۔ دباؤ کا تقاضا ہوتا ہے کہ چیزیں دوسروں کے طریقے کے مطابق عمل پیرا ہوں۔ تم اسے کیا کہو گے کہ سوا سبرامانیا ایّر نے مجھے اپنے باورچی خانے میں ظہرانے کے لیے مدعو کیا؟ میری بہن زہرہ نے اپنی چوڑیوں اور گلے کی زنجیر کو انجینئرنگ کالج میں میرے داخلے کے لیے گروی رکھ دیا؟ پروفیسر اسپانڈر کا اصرار کہ میں ان کے ساتھ گروپ فوٹو کے لیے صفِ اوّل میں بیٹھوں؟ معلق جہاز کو موٹر گیریج کے ماحول میں بنانا؟ سدھاکر کی ہمت؟ ڈاکٹر برہم پرکاش کی مدد؟ نارایَن کا انتظام؟

زیادہ اپنی عزت کرو۔"

میں کوئی فلسفی نہیں ہوں۔ میں تو محض تکنالوجی کا ایک آدمی ہوں۔ میں نے اپنی پوری زندگی راکٹ کی ترویج وعلم میں گزار دی۔ میں نے مختلف تنظیموں میں بہت بڑی تعداد میں کام کرنے والے طرح طرح کے لوگوں کے ساتھ کام کیا، اس لیے مجھے پیشہ ورانہ زندگی کے مظہر کو اس کی تمام الجھنوں اور پریشانیوں کے ساتھ سمجھنے کا موقع ملا۔ جو کچھ میں نے اب تک کہا ہے اس پر جب ایک نظر ڈالتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ مسائل کوئی آمرانہ انداز میں بیان کرتا ہے جو واقعتاً میرے مشاہدات اور نتائج کے سوا کچھ بھی نہ تھے۔ میرے ہم کاروں، ساتھیوں، قائدوں اور ڈرامے کے اصل ہیرو جن کے ساتھ میں نے زندگی گزاری، راکٹ کی ترویج وعلم کی پیچیدہ سائنس، تکنالوجی انتظام کے اہم مسائل۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کو تصویری انداز میں پیش کیا گیا۔ رنج اور راحت،

کارنامے اور ناکامیاں تناظر، وقت اور خلا میں نمایاں طور پر مختلف ہونے کے باوجود یکجا ہوگئے ہیں۔

جب تم ہوائی جہاز سے نیچے دیکھتے ہو تو لوگ، مکانات، چٹانیں، میدان، درخت سب کچھ ایک قسم کا ارضی منظر دکھائی دیتا ہے جس کو ایک دوسرے سے ممیّز کرنا (الگ کرنا، نمایاں کرنا) بہت مشکل ہوتا ہے۔ جو کچھ تم ابھی پڑھ چکے ہو دور سے دکھائی دینے والی میری زندگی کا ایک اجمالی منظر جیسا ہے، کاش کہ یہ ایسی ہوتی:

میری لیاقت ہے سب وہم میرا
اللہ کی خوبی ہے، سب خوف میرا
فرق ہر چند ہے یہ نمایاں
ظاہر ہوتا مگر ہے وصف میرا

یہ اس دور کی کہانی ہے جوگنی کی پہلی پرواز کے ساتھ ختم ہوگئی۔ زندگی بہرحال گزرتی رہے گی۔ اگر ہم 90 کروڑ لوگوں کی متحدہ قوم کی طرح سوچنے لگیں تو یہ عظیم ملک ہر میدان میں خوب ترقی کرے گا۔ میری یہ کہانی جینن العابدین کے بیٹے کی کہانی ہے جنھوں نے رامیشورم کے جزیرے کی موسک اسٹریٹ میں سو سال سے زیادہ گزارے اور وہیں انتقال کیا، یہ کہانی اس لڑکے کی ہے جس نے اپنے بھائی کی مدد کے لیے اخبار بیچے، یہ کہانی ہے اس شاگرد کی جس کی تربیت واسبرامانیا ایر اور آیا دورائی سولومن نے کی، یہ کہانی ہے اس طالب علم کی جسے پنڈالائی جیسے استادوں نے پڑھایا، یہ کہانی اس انجینئر کی ہے جسے ایم جی کے مینن نے دریافت کیا اور افسانوی شخصیت پروفیسر سارا بھائی نے سنوارا، یہ کہانی ہے اس سائنس داں کی جس کی آزمائش ناکامیوں اور مایوسیوں سے ہوئی، یہ کہانی ہے اس قائد کی جس کی حمایت ذہین اور مخلص پیشہ ور لوگوں کی ایک بڑی ٹیم نے کی۔ یہ کہانی میرے ساتھ ختم ہوجائے گی کیونکہ دنیاوی اعتبار سے میرے پاس کوئی میراث (جائیداد، ورثہ، ترکہ) نہیں ہے۔ میں نے کچھ بھی حاصل نہیں کیا، نہ مکان بنایا نہ کچھ جمع کیا، میرا کوئی گھربار ہے نہ بیٹے بیٹیاں۔

میں ایک چاہ ہوں اس ارض عظیم میں
اپنے بے شمار بچوں کو دیکھتی ہے جو
مجھ میں سے اخذ کرتے ہیں
لاانتہا (جس کی حد نہ ہو) تقدیس (پاکیزگی، پاکی)
اور خالق مطلق کی رحمت کو
چار دانگ عالم میں عام کرتے ہیں
کنویں سے کھینچا ہوا پانی جیسے
بہتا رہتا ہے ہر سو

دوسروں کے لیے میں اپنی کوئی مثال قائم نہیں کرنا چاہتا ہوں تاہم مجھے یقین ہے کہ کچھ نہ کچھ لوگ اس سے فیض حاصل کرسکتے ہیں اور اس مطلق (کامل، خالص، آزاد، مشروط) سکون کے توازن (تناسب برابری)، تک رسائی پاسکتے ہیں جو صرف فرشتوں کی زندگی میں ہی پایا جاسکتا ہے۔ توفیق الٰہی تمھاری میراث ہے۔ میرے پڑدادا اول (ابول)، میرے دادا پاکھر (فاخر) اور میرے باپ جینن العابدین (زین العابدین) کا سلسلۂ نسب تو عبدالکلام پر ختم ہوسکتا ہے مگر اللہ کی رحمت کبھی ختم نہیں ہونے والی کیونکہ وہ لازوال ہے۔

■

ماخذ: پرواز، مصنف: اے پی جے عبدالکلام، سنہ اشاعت: 2005، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

اندر جیت لال

زندگی میں سائنس

پچھلے ہزاروں برسوں میں پتھر، دھات اور حیوانی زندگی سے ارتقا کرتا ہوا آج کا انسان نئی روشنی کی زندگی تک آن پہنچا ہے۔ نئی روشنی کی اس زندگی تک پہنچنے کے پیچھے انسان کی لگاتار کوشش، تحقیق اور لگن کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ پرانے زمانے ہی سے انسان دراصل اس کوشش میں جٹا رہا کہ وہ ایک دن بہت بڑی ترقی پذیر طاقت بن سکے۔

بظاہر دیکھنے میں یہ ایک خواب تھا لیکن اسے انسان ایک دن حقیقت کے روپ میں دیکھنا چاہتا تھا۔ گئے ہزاروں برسوں میں انسان کے لیے یہ الجھن رہی کہ ان دنوں انسان کے پاس نہ تو آج کل کے زمانے کی مشینیں تھیں اور نہ بجلی اگر ایسی سہولتیں انسان کے پاس ہوتیں تو برسوں پہلے انسان کو جسمانی مشقت سے نجات مل جاتی۔

چنانچہ ان ہزاروں برسوں میں انسان نے مشینوں کی ایجاد کی۔ دریافت، انکشافات اور تحقیق کے کئی ڈھنگ اختیار کیے۔ نئے نئے آلے ڈھالنے کے طریقے اپنائے، پیداواری طاقتوں کو ایک حد تک بڑھایا اور پیداوار حاصل کرنے کے ڈھنگوں میں تبدیلی کی۔

ان سائنسی ایجادوں، آرام و آسائش کی چیزوں اور مشینوں کے استعمال کا انسان کی زندگی کے ہر پہلو پر بڑا اثر پڑا۔ ہاں اس کا سب سے زیادہ اثر انسان کے رہن سہن پر پڑا۔ چنانچہ کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، سفر کرنے، عیش و آرام کرنے، کاروبار، صنعت، حرفت کا

قومی یوم سائنس

کام کرنے غرضیکہ زندگی کے ہر کام کاج میں سائنس نے نئے طور طریقے، نئے ضابطے، نئے اصول، نئے رنگ ڈھنگ اور نئی تہذیب دی۔ خوراک میں وٹامن کے اجزا جو پہلی جنگِ عظیم تک نامعلوم تھے۔ آج انسان کو صحت اور تندرستی کی طرف لے جانے میں معاون ثابت ہوئے ہیں۔ پلاسٹک کی ہلکی سستی اور خوبصورت مصنوعات دھاتوں کا ایک اچھا نعم البدل ثابت ہوئی ہیں۔ ایک سائنسی نقاد لکھتے ہیں ''عصرِ حاضر میں انقلاب کا بیحد موثر داعی سائنس ہے۔ سائنس نے انسان کی مادی اور معنوی۔ ظاہری اور باطنی، زندگی کے ہر شعبے کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا ہے انسان کے افکار و خیالات میں احساس و جذبات میں ایک تلاطم برپا کیا ہے۔''

سائنس دراصل اپنے ساتھ ایک انقلاب لے آئی ہے، خاص طور پر سائنسی تحقیق نے کمال کی حدوں کو چھو لیا ہے۔ آج یہ تحقیق اس درجہ بڑھ چکی ہے کہ سائنس داں اس معاملہ پر خاص طور پر مغز پچی کر رہا ہے کہ پودوں اور جانوروں کی بہتر نشو و نما کے لیے کیا مناسب خوراک ہونی چاہیے۔ کس طرح اس میں بہتری پیدا کی جائے۔ خود انسان کی خوراک میں کون سی چیز کس مقدار میں، کس عمر میں اور کس وقت ملنی چاہیے۔ مختصر یوں سمجھیے کہ آج انسان کی نظر اور تحقیق اس بات پر ہے کہ انسانی خوراک متوازن ہونی چاہیے اس میں مناسب مقدار میں پروٹین، معدنیات اور حیاتین موجود ہونے چاہئیں۔ اس کے ساتھ ساتھ آج کے انسان پر سائنس کا یہ اثر بھی بڑا زوردار ثابت ہوا ہے کہ بہتر سے بہتر اناج، سبزی اور پھل پیدا کرے، بہتر سے بہتر جانوروں کو پالے تاکہ ان سے گوشت اور اون حاصل کر سکے۔

فنِ تعمیرات میں سائنس کا اثر واضح طور پر جدید دور میں ظاہر ہوا ہے وہ یہ کہ آج کے انسان نے اپنی ضرورت اور تقاضوں کے مطابق ہوادار، کھلی اور صاف جگہ کو اہمیت دی ہے کہ گئے وقتوں کے کلسوں، محرابوں اور خوبصورت دیواروں کو، گویا جمالیاتی تقاضوں کی جگہ ظاہری ضروریات اور سادگی کی اہمیت آج کے دور میں بڑھ چکی ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ آج کی فلک بوس عمارتوں میں محض خوبصورت اور گراں ساماں کی جگہ فولاد سیمنٹ اور شیشے کا استعمال ہوتا ہے، تاکہ کم سے کم خرچ سے پختہ اور زیادہ گھیراؤ والی جگہ تیار مل سکے۔

سائنس نے موسیقی کو بھی متاثر کیا ہے، ایک مغربی موسیقار مبصر کے بیان کے مطابق ہائڈروجن (جس کی اہمیت آج کے ایٹمی دور میں کئی گنا بڑھ گئی ہے) بڑی زوردار اور کئی تہہ دار توانائی پیدا کرتا ہے جس کا استعمال موسیقانہ ہو سکتا ہے۔ ویسے موسیقی کا اثر زندگی پر یہ پڑتا ہے کہ انسان اس سے ذہنی تسکین اور روحانی خوشی حاصل کرتا ہے اور سائنس کی ہی بدولت انسان دنیا کے لوازمات کی گہرائی و گیرائی سے آشنا ہوتا ہے۔

عام زندگی میں سائنس کا اثر جانچنے کے لیے کسی دن کو لے لیجیے۔ پو پھٹتے ہی گھڑی کا الارم آپ کے سرہانے بجا۔ آپ نے جمائی لی، جاگے اور پھر سارا دن گھڑی آپ کے کام کاج کے اوقات بتانے اور اس پر پابند رہنے کے لیے آپ کی راہ سجھاتی رہی۔ کچھ وقت بعد آپ گرم پانی سے نہانے کے لیے حمام میں تشریف لے گئے جہاں بجلی کے ہیٹر سے پانی گرم ہوا جا رہا تھا۔ نہانے کے بعد آپ نے نئے فیشن کے اجلے کپڑے پہنے۔ یہ کپڑے ان بڑی بڑی مشینوں سے تیار ہوئے

تھے جو بجلی یا بھاپ سے چلتی ہیں۔ آپ ناشتہ کے لیے بیٹھ گئے۔ ریفریجریٹر سے کھانے کا کچھ سامان نکالا۔ بجلی کی کیتلی میں چائے تیار کی اور پینے لگے۔ آپ ساتھ ساتھ اخبار پڑھ رہے ہیں۔ یہ خبریں ایک بہت بڑے چھاپے خانے میں چھپیں۔ جو اخبار کے دفتر سے ٹیلی فون، ٹیلی پرنٹر۔ ٹیلی گراف اور ڈاک کے ذریعے حاصل کی تھیں پھر آپ دفتر یا کارخانے یا روزانہ کام کاج یعنی معمول کے لیے اسکوٹر، کار یا بس میں سوار ہوکر اپنی منزل کی طرف چل دیئے۔ یہ اسکوٹر کار یا بسیں پٹرول، ڈیزل یا انجن سے چلتی ہیں، آپ دفتر یا کارخانے تک آپہنچے اور اوپر کی منزل تک لفٹ کے ذریعے پہنچے اور کئی بار لفٹ سے پانچویں منزل تک نویں منزل تک یا بارہویں منزل تک پہنچے۔

آپ کا کمرہ بجلی کے قمقموں یا ٹیوبوں سے جگ مگ کر رہا تھا۔ چھت پر پنکھے اور دیوار سے لگے کولر چل رہے تھے۔ آپ نے اپنی سیٹ سنبھال لی اور کام کاج میں جٹ گئے۔ آپ نے اسٹینوگرافر کو کچھ ہدایتیں دیں، اس نے آپ کی ہدایت ٹائپ مشین پر فوراً ٹائپ کرکے آپ کے سامنے رکھ دی۔ پھر آپ کو کسی دوست یا دفتر سے کچھ بات چیت کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، آپ نے ٹیلی فون پر بات چیت کر لی۔ کچھ دیر بعد آپ کو یاد آیا کہ آپ کو کسی دور دراز جگہ پر ایک ضروری پیغام بھیجنا تھا۔ آپ نے اسے تار کے ذریعہ بھجوا دیا، اور اگر آپ کو کسی دور دراز جگہ پر فوراً پہنچنا ہوا تو آپ ہوائی جہاز پر سفر کے لیے روانہ ہوگئے یا بذریعہ گاڑی۔ اندازہ کیجیے کہ سائنس کے سہارے ہمارے سب کام رواں دواں ہیں اور اس کے بغیر ہم ایک منٹ بھی زندگی کی گاڑی نہیں چلا سکتے۔

آج کی زندگی کا دارومدار سائنس پر ہے یا یوں کہیے کہ مشین پر ہے اور اس مشین کے بغیر زندگی کی گاڑی ایک لمحہ بھی نہیں چل سکتی۔ یہ مشین خواہ بھاپ سے چلے یا بجلی سے یا پٹرول سے یا ایٹمی شکتی سے۔ یہ انسان کا کمال کہیے کہ اس نے مشین کی بدولت قدرت کے کارخانے کو کئی ڈھنگوں سے چلایا ہے۔ یہ مشین نہ ہوتی تو اس زمانے میں انسانی زندگی کا معاشرہ کچھ اور ڈھنگ کا ہوتا اور انسانی زندگی پتھر اور دھات کے زمانے کی یاد دلاتی۔ فی زمانہ مشین نے انسان کی مشقت اور تھکاوٹ کو ایک حد تک کم کیا ہے۔ سخت کام انسان گزرے ہوئے زمانے میں بڑی جسمانی مشقت اور محنت سے کرتا تھا۔ آج کل مشین کی مدد سے بڑی پھرتی سے اور تھوڑے وقت میں کر سکتا ہے اور کام بھی اچھے ڈھنگ اور خوش اسلوبی سے۔

آج کے دور میں بھاری وزن ایک جگہ سے دوسری جگہ تک لے جانے کے لیے کرین (لوہے کی سیڑھی نما مشین جو سامان ادھر سے اُدھر اٹھا کر لے جاتی ہے) ہمارے بازو بن چکی ہے، آنے جانے اور بھاگ دوڑ کے کاموں میں گاڑی اور موٹریں ہماری ٹانگوں کا بدل ثابت ہوئی ہیں، چھاپے خانوں اور ٹائپ مشینوں نے لکھنے پڑھنے اور پڑھانے کے کام کو بڑا اطمینان بخشا ہے، ہماری یادداشت کے بوجھ کو ہلکا کیا ہے۔

سائنس نے انسان کو جہالت اور اندھیرے سے نکال کر علم وتہذیب سے روشن کیا ہے اور ایسا رہن سہن پیدا کر دیا ہے جس کی بدولت انسان بڑی تیزی سے ترقی کی طرف بڑھ سکتا ہے۔

■

ماخذ: سائنس کی باتیں، **مصنف:** اندرجیت لال، **تیسرا ایڈیشن:** 2006، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

عظیم اقبال

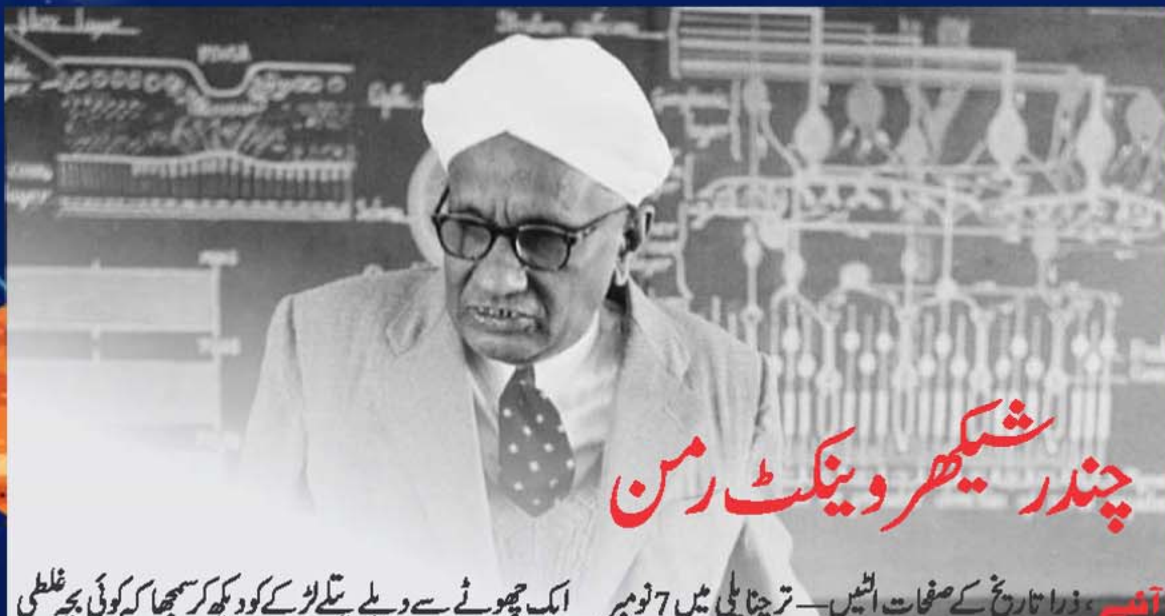

چندر شیکھر وینکٹ رمن

آئیے، ذرا تاریخ کے صفحات الٹیں— ترچناپلی میں 7 نومبر 1888 کو ایک کسان کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوا۔ والدین کو بڑی خوشی ہوئی۔ لڑکا دھیرے دھیرے بڑا ہوگیا۔ والدین کی خواہش تھی کہ ان کا لڑکا خوب پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنے، لیکن یہ گاؤں میں رہ کر ممکن نہیں تھا۔ اس لیے والد گاؤں چھوڑ کر شہر میں آگئے— شہر میں آکر والد نے ایک اسکول میں کام کرنا شروع کیا۔ پڑھانے کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی پڑھتے تھے۔ والدہ مذہبی خیالات والی بہت نیک خاتون تھیں۔ یہ سب خوبیاں ننھے رمن نے اپنے والدین سے اپنالیں۔ والد رمن کو سائنس اور ریاضی خود پڑھاتے تھے۔ بارہ سال کی عمر میں رمن نے اوّل درجہ میں میٹرک پاس کرلیا۔

رمن کو پڑھائی کے علاوہ کسی چیز کا شوق نہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رمن جہاں پڑھنے میں بہت ہوشیار ہوگئے، وہاں صحت کے نقطۂ نظر سے وہ بہت کمزور ہوگئے۔ نہ وہ قد کے لمبے ہوئے اور نہ ہی جسمانی طور پر صحت مند!

ایک دن بی اے کی کلاس میں آئے ایک نئے استاد نے ایک چھوٹے سے دبلے پتلے لڑکے کو دیکھ کر سمجھا کہ کوئی بچہ غلطی سے اونچی کلاس میں آبیٹھا ہے۔

انھوں نے رَمن سے پوچھا—

''کس درجہ میں پڑھتے ہو؟''

''جی، بی اے میں۔''

''ایف، اے کہاں سے کیا؟''

''والیئر کالج سے۔''

تب محترم استاد نے رَمن سے کئی سوال کیے۔ جواب سن کر استاد خوش ہو اٹھے۔ استاد کو لائق شاگرد مل گیا تھا۔

رمن نے نہ صرف یہ کہ سال بھر کے تجربات کچھ ہی دنوں میں ختم کرڈالے، بلکہ آگے کے تجربے بھی کرنے لگے۔

بی اے کا امتحان ہوا۔ رَمن بی اے میں پوری یونیورسٹی میں اوّل آئے۔ ایم، اے میں تو رَمن نے سب کو حیرت میں ڈال دیا۔ انھوں نے آواز پر تحقیق ہی کرڈالی۔ استاد کو یقین نہیں آیا۔ انھوں نے تجربہ کرکے دکھا دیا۔ استاد حیرت میں پڑ گئے۔ انھوں نے اپنی تحقیق کو تحریر کرنے کے لیے رَمن کو کہا—

رمن نے لندن سے شائع ہونے والے جریدے میں وہ مضمون بھیجا۔ مضمون جریدے میں شائع ہوگیا۔ ایم ایس سی کے امتحان میں بھی رمن نے یونیورسٹی میں اوّل مقام حاصل کیا۔ ان کی لیاقت کو دیکھ کر یونیورسٹی نے انھیں آگے پڑھنے کے لیے بیرون ملک بھیجنے کا فیصلہ کیا، لیکن ڈاکٹروں نے صاف انکار کردیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اتنی خراب صحت کا آدمی لندن کی سردی نہیں برداشت کرسکتا۔

ان کا سائنس کی طرف بڑھنے کا راستہ رک گیا، لیکن انھوں نے ہار نہیں مانی۔ انھوں نے حساب کتاب رکھنے کے محکمے کے امتحان کی تیاری شروع کردی۔ امتحان ہوا اور وہ اس میں کامیاب ہونے والوں میں سرفہرست رہے۔ انھیں ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل بنا دیا گیا۔ اس کے بعد وہ اکاؤنٹنٹ جنرل بن گئے، لیکن رمن کا دل اس میں لگا نہیں۔ ان کا دل تو سائنس کی تحقیق میں سرگرداں تھا، اور ایک دن وہ موقع بھی آ گیا۔

کلکتہ میں سائنس کا نیا کالج کھلا۔ دس سال کے بعد موقع نے رمن کے لیے دروازہ کھولا۔ انھوں نے دس سال کی نوکری چھوڑ کر اس سے کم تنخواہ پر سائنس کی پڑھائی کے لیے استاد کا عہدہ سنبھال لیا۔ دنیا میں پیسہ ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا۔ پیسے سے زیادہ اہم ہے سکونِ قلب! جو اطمینان انھیں اکاؤنٹنٹ جنرل کا عہدہ نہ دے سکا، وہ انھیں تدریس میں مل گیا۔ وہ وہاں نت نئے تجربے کرنے لگے۔

اس درمیان لندن میں سائنس کانفرنس ہوئی۔ یونیورسٹی کی طرف سے اس کانفرنس میں رمن کو بھیجا گیا۔ وہ بحری جہاز سے گئے۔ اس سفر نے تو انھیں چوٹی پر پہنچا دیا۔ بات یوں ہوئی کہ سمندر میں وہ پانی کا رنگ دیکھ رہے تھے۔ ایک سائنسداں کے لیے فطرت کی دریافت کے خزانے جگہ جگہ پر دفن ہیں۔ انھوں نے دیکھا کہ خلیج بنگال کا رنگ سمندر کے دوسرے حصے کے رنگ سے مختلف ہے۔ رمن نے تجربہ شروع کردیا۔ مسلسل 5 سال کی تفتیش کے بعد انھوں نے روشنی کے بکھرنے کے اصول کی دریافت کرلی۔ دنیائے سائنس دانوں نے ان کی تحقیق کو تسلیم کرلیا — اسے رمن افیکٹ (Raman Effect) کا نام دیا گیا — اس کے بقول:

"The alteration in frequency and random alteration in chase of light scattered in a material medium, used for investigating the structure of molecule."

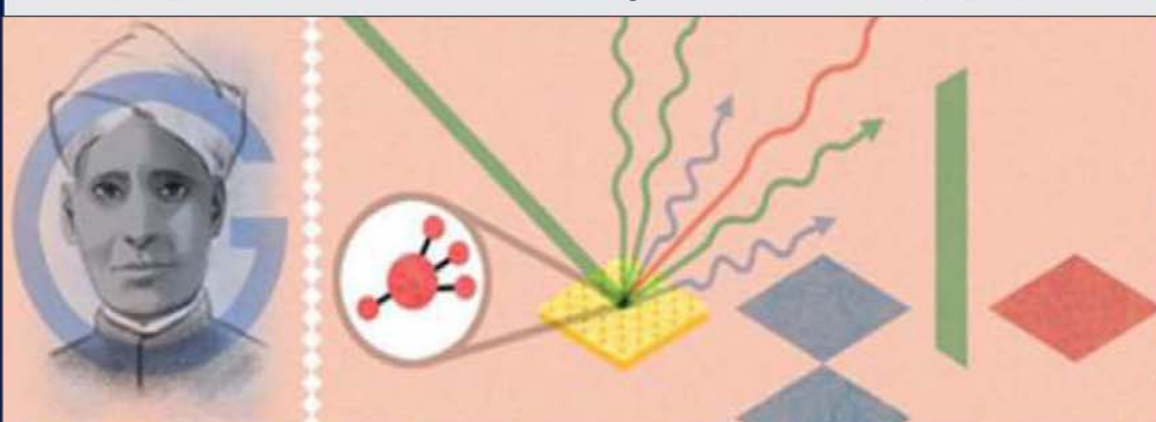

بہ الفاظ دیگر، یہ مطالعہ ذرّے کی ساخت، جو ماڈّی وسیلے سے متعلق ہے، کی تحقیق میں روشنی کی رفتار میں بدلاؤ کے مختلف ادوار سے وابستہ ہے۔

1929 میں انھیں 'سر' کا خطاب عطا کیا گیا، اور 1930 میں انھیں مشہور زمانہ نوبل انعام ملا۔ لندن کی رائل سوسائٹی نے ان کی عزت افزائی کی۔ 1947 میں ہندوستان آزاد ہوگیا۔ 1954 میں صدر جمہوریہ کی جانب سے انھیں 'بھارت رتن' کے اعلیٰ ترین اعزاز سے نوازا گیا۔ 1957 میں سوویت روس نے آپ کو لینن امن انعام تفویض کیا۔

ابھی ملک کو آپ سے بہت ساری امیدیں وابستہ تھیں کہ 21 نومبر 1970 کو موت کے پنجے نے آپ کو ہم سے چھین لیا۔

آپ کی زندگی کی سب سے بڑی تعلیم یہ ہے کہ لگن اور محنت سے چھوٹا سے چھوٹا فرد بھی عظیم بن سکتا ہے۔ ضرورت ہوتی ہے صحیح راستے پر چل کر جانفشانی کرنے کی!

ہر سال 28 فروری کو ہم 'قومی یوم سائنس' کا انعقاد کرتے ہیں۔ دراصل یہ رمن کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا ایک وسیلہ ہے۔ آپ نے 28 فروری 1928 کو اپنی تحقیق مکمل کی تھی۔

■

Azim Iqbal
Adabistan, Ganj No: 1
Bettiah - 845438 (Bihar)

Subscription Form "Bachon Ki Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں بچوں کی دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا/ چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر................................ بتاریخ..................................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِ تعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'بچوں کی دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

شفیع ایوب

رمن ایفیکٹ اور سی وی رمن

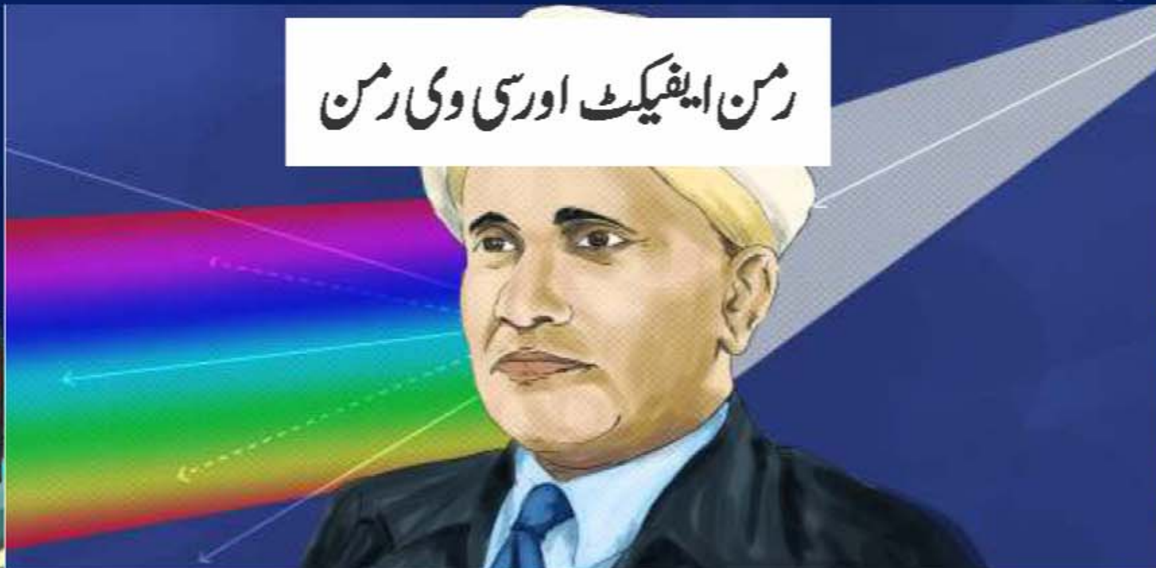

پیارے بچو! آپ نے سرسی وی رمن کا نام تو سنا ہی ہوگا۔ نہیں سنا ہے؟ کوئی بات نہیں۔ نوبل پرائز تو آپ جانتے ہی ہیں۔ 'نوبل' دنیا کا سب سے بڑا انعام ہے۔ نوبل پرائز نہ صرف کسی ایک شخص کے لیے بلکہ کسی بھی ملک کے لیے فخر اور عزت کی بات ہے۔ ہمارے ملک میں جن عظیم لوگوں کو نوبل پرائز سے نوازا گیا ہے ان میں سرسی وی رمن کا نام کئی لحاظ سے بہت اہم اور ممتاز ہے۔ انھیں سنہ 1930 میں علم طبیعیات (Physics) کے لیے نوبل پرائز ملا تھا۔ اس وقت نہ صرف ہندوستان بلکہ ایشیا میں سائنس کے لیے نوبل پرائز حاصل کرنے والے وہ پہلے شخص تھے۔

سی وی رمن کا پورا نام چندر شیکھر وینکٹ رمن تھا۔ انھیں 'سر' کا خطاب ملا تھا۔ اس طرح وہ دنیا بھر میں سرسی وی رمن کے نام سے مشہور ہوئے۔ وہ 7 نومبر 1888 کو موجودہ تمل ناڈو کے ترچی میں پیدا ہوئے۔ اس وقت تمل ناڈو کے نام سے ریاست نہیں تھی۔ اسے مدراس پریسیڈینسی کہتے تھے۔ ان کے والد چندر شیکھرن راما ناتھن ایر علم ریاضی کے لکچرر تھے۔ ان کی والدہ کا نام پاروَتی امّل تھا۔ رمن بچپن سے ہی بہت ذہین اور محنتی طالب علم تھے۔ صرف گیارہ سال کی عمر میں انھوں نے میٹرک کا امتحان اور تیرہ سال کی عمر میں بارہویں کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کر لیا۔ پریسیڈینسی کالج مدراس سے انھوں نے علم طبیعیات (Physics) میں امتیازی نمبروں سے فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن سے گریجوایشن کا امتحان پاس کیا۔ اس کے لیے انھیں گولڈ میڈل سے نوازا گیا۔ 1907 میں انھوں نے مدراس یونیورسٹی سے ایم ایس سی کی ڈگری بھی امتیازی نمبروں سے حاصل کی۔ ان کے اساتذہ نے اسی وقت پیشن گوئی کی تھی کہ یہ لڑکا کوئی بڑا کارنامہ انجام دے گا۔ اور وہ وقت بھی آیا جب سی وی رمن نے نوبل پرائز جیت کر اپنے اساتذہ کی پیشن گوئی کو صحیح ثابت کر دکھایا۔

بچوں آپ کو معلوم ہے کہ سمندر کا رنگ نیلا ہوتا ہے، اور آسمان بھی نیلا ہوتا ہے۔ پہلے یہ مانا جاتا تھا کہ آسمان کا عکس پڑنے کی وجہ سے سمندر نیلا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن ہندوستانی سائنسداں سرسی وی رمن کی ریسرچ کے بعد یہ معلوم ہوا کہ

سمندر کا پانی خود نیلے رنگ کو اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔سر سی وی رمن نے رنگ (Colour) اور روشنی (Light) پر بہت کام کیا۔ رنگ اور روشنی کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟ اس پر انھوں نے کئی برس ریسرچ کی۔ وہ اکثر سوچتے تھے کہ سورج کی روشنی کا اصل رنگ کیا ہے؟ اور خود روشنی کے اندر کتنے رنگ چھپے ہوتے ہیں؟ روشنی ہماری آنکھوں سے ٹکراتی ہے تو کون کون سے رنگ بکھرتے ہیں؟ ان باتوں پر ایک دو سال نہیں بلکہ دس بارہ سال انھوں نے غور کیا۔ لگاتار محنت اور توجہ کے سبب انھوں نے روشنی اور رنگ کے رشتوں کی ایسی جانچ پڑتال کی کہ مستقبل کے سائنس دانوں کو ایک نئی راہ دکھا کر گئے۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد سی وی رمن اعلیٰ پیمانے پر ریسرچ کرنا چاہتے تھے۔ اس زمانے میں کلکتہ (اب کولکاتا) علم و ادب کا بڑا گہوارہ تھا۔ بچو! آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ انگریزوں نے ایک زمانے میں کلکتہ کو اپنی راجدھانی بنائی تھی۔ علم و ادب کے کئی بڑے ادارے کلکتہ میں قائم کیے گئے۔ کلکتہ یونیورسٹی میں سائنس کا بڑا اہم شعبہ قائم تھا۔ وہاں مشہور اسکالر سر تارک ناتھ پالت نے کلکتہ یونیورسٹی کو قریب پندرہ لاکھ روپے کا چندہ دیا تھا۔ اس زمانے میں جب ایک ٹیچر کی ماہانہ تنخواہ پچاس روپے بھی نہیں تھی تب پندرہ لاکھ روپے کی کتنی زیادہ اہمیت ہوگی یہ آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔ سر تارک ناتھ پالت نے چندے کی جو رقم دی اس سے شعبہ طبیعیات میں ایک چیئر قائم کی گئی جسے 'پروفیسر پالت چیئر' کا نام دیا گیا۔ اس چیئر کی بڑی اہمیت تھی۔ کلکتہ یونیورسٹی کی خوش بختی تھی کہ اس چیئر پر پہلا تقرر سی وی رمن کا ہوا۔ یعنی سی وی رمن اب پروفیسر سی وی رمن بن کلکتہ یونیورسٹی پہنچ گئے۔ یہاں کلکتہ یونیورسٹی میں پڑھانے کے ساتھ ساتھ وہ ریسرچ میں بھی مشغول رہے۔ روشنی کے انتشار پر وہ ریسرچ کر رہے تھے۔ روشنی کس طرح پھیلتی ہے، وہ اکثر سوچا کرتے تھے کہ روشنی کیا ہوا اور پانی میں ایک ہی طرح پھیلتی ہے؟ اگر درمیان میں کوئی ٹھوس اشیا آجائیں تو کیا روشنی کی کرنیں اپنا راستہ بدل لیتی ہیں؟ اسی کھوج کو بعد میں دنیا نے ان کے نام پر ہی اسے ''رمن افیکٹ'' قرار دیا۔ یعنی سر سی وی رمن نے روشنی کی رفتار، سمت اور انتشار کے حوالے سے جو کھوج کی اسے 'رمن افیکٹ' کہا گیا۔ اس دریافت نے بعد میں علم طبیعیات میں بڑی انقلابی تبدیلیاں کیں۔ اس زمانے میں انھوں نے ایک سائنسی تنظیم آئی اے سی ایس بھی جوائن کر لیا تھا۔ کلکتہ یونیورسٹی میں اپنے قیام کو سی وی رمن نے بہت اہم قرار دیا ہے۔ یہیں 1926 میں پروفیسر رمن نے ایک تحقیقی جرنل کی اشاعت شروع کی۔ 'انڈین جرنل آف فزکس' نام کے اس تحقیقی جرنل کے وہ بانی ایڈیٹر تھے۔ 28 فروری 1928 کا دن سی وی رمن کے لیے اور فزکس کے لیے بھی ایک تاریخی دن تھا۔ اسی دن سی وی رمن نے اپنے رفیق کار کے ایس کرشنن کے ساتھ مل کر ایک کامیاب تجربہ کیا۔ جس میں روشنی کے منتشر ہونے کی پوری واردات کو ریکارڈ کیا گیا۔ بعد میں جب اپنے تحقیقی جرنل 'انڈین جرنل آف فزکس' میں اس کی رپورٹ شائع کی تو دنیا میں ایک ہلچل پیدا ہو گئی۔ اسی رپورٹ میں وہ روداد درج تھی جسے بعد میں 'رمن افیکٹ' قرار دیا گیا۔ رمن کو امید تھی کہ انھیں 1928 میں ہی نوبل پرائز مل جائے گا۔ لیکن کسی وجہ سے انھیں یہ نہایت پُر وقار انعام 1930 میں ملا۔ لیکن اس سے

پہلے 1929 میں تیس ہزار سائنسدانوں کی تنظیم 'انڈین سائنس کانگریس' کے سولہویں اجلاس کی صدارت پروفیسر سی وی رمن کر چکے تھے۔ انڈین سائنس کانگریس کے کسی اجلاس کی صدارت اپنے آپ میں بڑے اعزاز کی بات ہے۔ اسی سال لندن کے مشہور رائل سوسائٹی کے سالانہ اجلاس میں نیوکلیئر فزکس کے باوا آدم سر ارنیسٹ ردرفورڈ اپنی صدارتی تقریر میں سی وی رمن کی غیر معمولی کھوج کا ذکر کر چکے تھے۔ اسی سال سی وی رمن کو 'نائٹ ہڈ' بھی ملا اور یورپ کی کئی یونیورسٹیوں نے انھیں اعزازی ڈاکٹریٹ سے بھی نوازا۔ جس وقت سی وی رمن اپنی ریسرچ کی آخری منزل پر تھے۔ اسی وقت روسی سائنسداں جی ایس لینڈ برگ نے بھی روشنی کے انتشار پر اپنی ریسرچ رپورٹ شائع کی۔ لیکن ان کی ریسرچ صرف روایتی کرسٹل میں روشنی کے بکھرنے سے متعلق تھی۔ جبکہ سی وی رمن نے جو ریسرچ کی وہ کرسٹل، گیس اور رقیق مادے میں روشنی کے انتشار سے متعلق تھا۔ اسی لیے روسی سائنسداں لینڈ برگ کے مقابلے میں سی وی رمن کا انتخاب 1930 کے نوبل پرائز کے لیے کیا گیا۔ رمن ایفیکٹ سے نیوکلیئر فزکس اور اٹامک فزکس کو بہت زیادہ ترقی ملی۔

نوبل پرائز حاصل کرنے کے بعد سر سی وی رمن خاموش نہیں بیٹھے۔ اب ان کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی تھیں۔ انھوں نے اپنے ملک میں سائنس کو مقبول بنانے اور اعلیٰ معیار کے سائنسی ادارے قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ سائنس کی درس وتدریس اور خصوصاً فزکس کو مقبول بنانے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ ان کی کوشش تھی کہ ہندوستان میں زیادہ سے زیادہ طلبہ فزکس میں دلچسپی لیں اور ایک سائنسداں کے طور پر ملک کی ترقی میں اپنا رول ادا کریں۔ بنارس ہندو یونیورسٹی میں وہ مستقل وزیٹنگ پروفیسر کے طور پر کام کرتے رہے۔ وہاں انھوں نے کئی اہم موضوعات پر بہت پُر مغز لکچر دیے۔ وہ ایک ممتاز سائنسداں ضرور تھے لیکن عام لوگوں سے بھی واسطہ رکھتے تھے۔ ماچس جیسی معمولی چیز جو ہر گھر کی ضرورت ہے، وہ بھی آزادی سے پہلے کے ہندوستان میں آسانی سے نہیں ملتی تھی۔ سر سی وی رمن نے اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ مل کر ایک کمپنی بنائی جو ماچس بنانے کے لیے ضروری کیمیکل پوٹیشیم کلوریٹ بناتی تھی۔ سی وی رمن کا مقصد اس کمپنی سے پیسہ کمانا نہیں تھا بلکہ وہ اپنے ملک کی ایک چھوٹی مگر اہم ضرورت کو پورا کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔ 1947 میں جب ہمارا ملک آزاد ہوا تو حکومت ہند نے سر سی وی رمن کو پہلا نیشنل پروفیسر بنایا۔ وہ ایک زمانے تک بنگلور کے انڈین انسٹیٹیوٹ آف سائنس سے بھی وابستہ رہے۔ 1948 میں سر سی وی رمن انڈین انسٹیٹیوٹ آف سائنس سے رٹائرڈ ہوئے۔ رٹائرمنٹ کے بعد انھوں نے بنگلور میں ہی 'رمن ریسرچ انسٹی ٹیوٹ' کی بنیاد رکھی۔ 1970 میں 80 سال کی عمر میں جب ان کا انتقال ہوا اس وقت تک وہ اپنے قائم کردہ 'رمن ریسرچ انسٹی ٹیوٹ' کے ڈائریکٹر کے طور پر خدمات دیتے رہے۔ زندگی کی آخری سانس تک وہ ملک کی خدمت کرتے رہے۔ خدمت کے اسی جذبے کی وجہ سے حکومت ہند نے ان کو ملک کے سب سے بڑے ایوارڈ 'بھارت رتن' سے نوازا تھا۔

■

Dr. Shafi Ayub
Centre of Indian Languages
SLL&CS / JNU, New Delhi - 110067
shafiayub75@rediffmail.com

شجاع الدین شاھد

بابائے میزائل

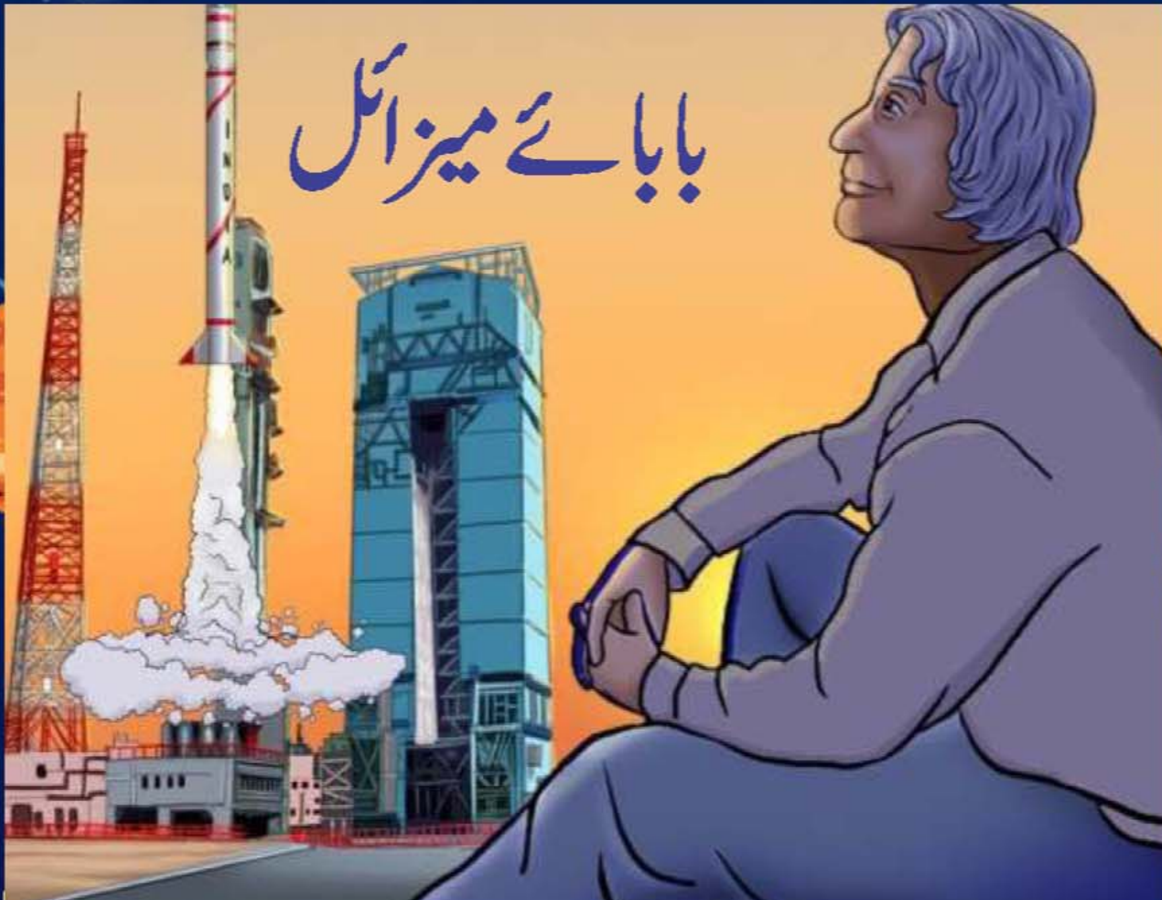

یہ سچ ہے کہ محنت، لگن اور حوصلہ انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔ کون جانتا ہے کہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھنے والا ماہی گیر کا بیٹا، جو گھر کے اخراجات پورا کرنے کے لیے اخبار بیچتا ہے اور اپنی تعلیم بھی جاری رکھتا ہے۔ آگے چل کر عظیم شخصیت کا مالک بنے گا۔ یہ عظیم شخصیت کوئی اور نہیں بلکہ ہندوستان کے اب تک کے سب سے چہیتے صدرِ جمہوریہ ڈاکٹر ابوالفاخر زین العابدین عبدالکلام ہیں۔

آپ 15 اکتوبر 1931 کو جنوبی ہندوستان کی ریاست تامل ناڈو کے ساحلی قصبے رامیشورم میں ایک غریب خاندان میں پیدا ہوئے۔ مگر غریبی ان راہوں میں کبھی رکاوٹ نہیں بنی کیونکہ انھیں بچپن سے ہی اونچے خواب دیکھنے کی عادت تھی اور انھیں خوابوں کی تکمیل کے لیے جدوجہد کرتے رہے اور کامیاب بھی ہوئے۔

وہ بچوں کے بڑے گرویدہ تھے۔ جہاں انھیں بچوں سے ملاقات کا موقع ملتا ان سے ضرور ملاقات کرتے تھے۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ان کی زندگی کے آخری لمحات بچوں سے خطاب کرتے ہوئے گزرے اور بچوں کے درمیان ہی انھوں نے آخری سانس لی۔ شاید یہ ان کی خواہش ہو کہ انھیں موت ایسے وقت میں آئے جب وہ مستقبل کے معماروں سے گفتگو کر رہے ہوں۔

اک بار ایک طالبہ نے جس کی عمر 16 سال تھی آپ سے آٹوگراف مانگا۔ آپ نے اس لڑکی سے پوچھا "تمھاری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ لڑکی نے کہا "میں ایک ترقی یافتہ ملک میں رہنا چاہتی ہوں۔" یہ سن کر ڈاکٹر عبدالکلام بڑے خوش ہوئے اور لڑکی سے کہا "یہ مقام حاصل کرنے کے لیے ہمیں تمھیں اور سارے سماج کو مل کر جدوجہد کرنی ہوگی۔"

یہ حقیقت ہے کہ میزائل سازی ان کا ایسا کارنامہ ہے جس پر مستقبل کا ہندوستان بھی رشک کرے گا۔ انھوں نے اگنی، پرتھوی، جیسی میزائلیں بنائیں— اور ہندوستان کو تکنیکی میدان میں خودکفیل بنانے کی کوشش کی۔ لیکن صرف ان کا میدانِ عمل یہی نہیں تھا بلکہ ایک نئی نوجوان نسل ملک وقوم کے لیے تیار کرنا بھی ان کا مقصد تھا۔ ان کا طلبا کے درمیان جانا، انھیں راہ دکھانا، حوصلہ دینا، عزم پیدا کرنا، ان کے بنیادی مقصد میں شامل تھا۔ انھوں نے صرف میزائل ہی نہیں بنایا بلکہ ایسی نسل کی تیاری میں مشغول ہوئے جو درجنوں میزائل بنا سکتی ہو۔

ڈاکٹر عبدالکلام ایک سائنسداں کے ساتھ ساتھ بہت اچھے مصنف بھی تھے ان کی کتاب 'ونگس آف فائر' (پرواز) کے نام سے اردو میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے جس کے مطالعے کے بعد آگے بڑھنے اور ایک نئے حوصلے کی ترغیب ملتی ہے۔ انھوں نے ایک موقع پر بڑی اچھی مثال پیش کی تھی۔

"جب بارش ہوتی ہے تو پرندے اپنے اپنے گھونسلوں میں دبک جاتے ہیں مگر شاہین آشیانوں کا رخ نہیں کرتا وہ بادلوں سے بھی اونچا ہو جاتا ہے۔"

ایک بار بچوں سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا "آسمان کی طرف دیکھیے ہم اکیلے نہیں ہیں، ساری کائنات ہمارے ساتھ ہے جو لوگ خواب دیکھتے ہیں اور محنت کرتے ہیں خدا انھیں اس کا صلہ دیتا ہے۔" ڈاکٹر عبدالکلام نے نئی نسل کو یہ پیغام بھی دیا کہ "اصل خواب وہ نہیں ہیں جو ہم سوتے ہوئے دیکھتے ہیں بلکہ وہ ہیں جو ہم جاگتے ہوئے دیکھتے ہیں اور انھیں شرمندہ تعبیر کرنے میں لگ جاتے ہیں۔"

ڈاکٹر عبدالکلام ہمارے ہندوستان کے اب تک سب سے چہیتے صدر جمہوریہ ہند رہے ہیں جو عام آدمی کے صدر تھے۔ آپ کے صدارتی محل کے دروازے ہر خاص وعام کے لیے ہمیشہ کھلے رہے۔ جب تک وہ زندہ رہے انھوں نے ملک وقوم کو فلاح وترقی کے تعلق سے سنجیدگی سے نئی نسل سے رابطہ قائم کیا اور انھیں نئی راہ دکھانے کی کوشش کی۔

ڈاکٹر عبدالکلام واقعی ایک اعلیٰ دماغ، نیک دل، خوش مزاج شخصیت کے مالک تھے۔

وہ خوش اخلاق اور انکساری کا پیکر تھے۔ آپ سبھی مذاہب کا یکساں احترام کرتے تھے۔ رامائن اور گیتا کا گہرا مطالعہ آپ نے کیا تھا، ساتھ ہی قرآن پاک کی تلاوت سے بھی غافل نہیں تھے۔

فلک برسوں گردش کرتا ہے تب جا کر ایسی عظیم شخصیتیں پیدا ہوتی ہیں۔ افسوس کہ انسانیت کا یہ پتلا 27 جولائی 2015 کو ہم سے جدا ہو کر اپنے مالکِ حقیقی سے جاملا—

■

Shujauddin Shahid
304- Mansrover Apt
A. Wing-Malwani
Mahada - Malad (W)
Mumbai - 400095 (Maharashtra)

مقبول احمد سراج

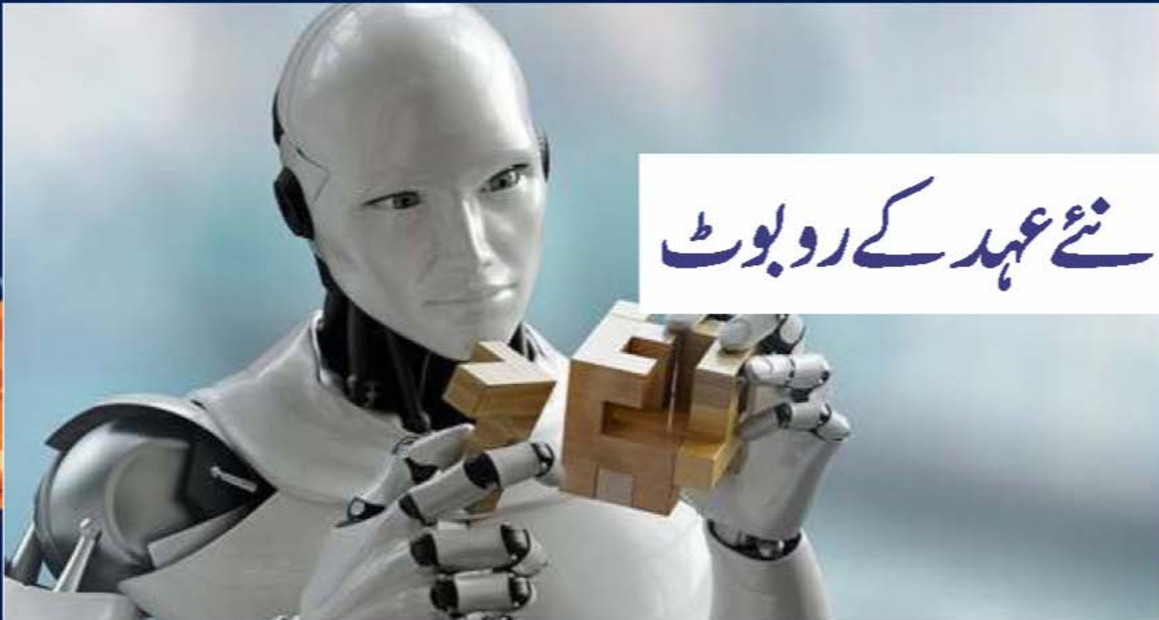

قومی یوم سائنس

نئے عہد کے روبوٹ

روبوٹ ذہین مشینوں کو کہتے ہیں جو وہ تمام کام کرسکتی ہیں جو انسان کرتے ہیں۔ سترہویں صدی کے صنعتی انقلاب کے بعد انسان نے مشینیں ایجاد کیں اور آج لاکھوں مشینیں انسانوں کی مدد کرتی ہیں۔ روبوٹ اس صنعتی انقلاب کے تازہ ترین دور کی پیداوار ہے۔ آج کا انسان وہ تمام کام روبوٹ سے لینے لگا ہے جو وہ خود کرسکتا ہے اور ایسے بھی کام روبوٹ کے سپرد کرنے لگا ہے جو خود کے لیے خطرہ ونقصان کا باعث ہوسکتے ہیں۔

کچھ قومیں مثلاً جاپانی ملک میں افرادی قلت کی وجہ سے بھی روبوٹوں پر منحصر ہوتے جارہے ہیں۔ جاپان میں فی الحال ڈھائی لاکھ روبوٹ مختلف کام کررہے ہیں۔ اندازہ ہے کہ 2030 تک جاپان میں تقریباً دس لاکھ روبوٹ کام کررہے ہوں گے۔ اس کی ایک بڑی وجہ جاپان میں کام کرنے والے افراد میں ہورہی کمی ہے۔ جاپان ایک صنعتی ملک ہے اور ہرسو میں محض 12 افراد وہاں کھیتوں میں کام کرتے اور گاؤں میں رہتے ہیں۔ پیداواری صلاحیت 20 سے 60 برس کے لوگوں میں ہوتی ہے اور جاپان میں ایسے افراد کی تعداد گھٹ رہی ہے۔ 1995 اور 2017 کے درمیان اس عمر کے افراد میں کوئی 20 لاکھ لوگوں کی کمی واقع ہوئی ہے۔ لہٰذا جاپان ان مقاصد کے لیے روبوٹ کو ترجیح دینے لگا ہے۔ جاپان باہر کے ممالک سے مہمان ورکر بلانا نہیں چاہتا جیسا کہ خلیجی ممالک میں دیکھا گیا ہے۔

جاپان نے روبوٹ سازی میں 40 برس قبل قدم رکھا۔ پہلے پہل ایسے روبوٹ بنے جو محض تکراری (Repetitive) نوعیت کے کام کرتے تھے مثلاً فیکٹریوں میں مشروب کی بوتلوں پر ڈھکن لگانا، اسکرو کسنا، لیبل چسپاں کرنا، دواؤں اور خوردنی اشیا کو پاکٹوں میں بھر کر سیل (Seal) کرنا وغیرہ۔ مگر اب جاپان ایسے روبوٹ تیا کررہا ہے جو انسانوں کا بدل ہوتے ہیں مثلاً اسپتالوں میں مریض کا ٹمپریچر دریافت کرنا، ریستورانوں میں کھانے میزوں تک پہنچانا، فارمیسی کی شیلفوں سے ادویہ اٹھا کر سیل کاؤنٹر تک لے جانا، زلزلہ زدہ علاقوں میں

جا کر بربادی کی تصاویر لینا اور انھیں امدادی ٹیم تک پہنچانا، ایئر کنڈیشنروں کی ڈکٹ (Duct) کے اندر داخل کر مکڑی کے جالے اور گرد صاف کرنا، عمارتوں پر آگ بجھانا اور باغوں میں پھل توڑ کر انھیں سائز کے لحاظ سے ڈبوں میں پیک کرنا وغیرہ۔

جاپان میں ہر برس شہر ٹوکیو میں دو بار روبوٹ اور روبوٹکس کی نمائش منعقد ہوتی ہے۔ اس نمائش میں روبوٹ ساز کمپنیاں اپنی مصنوعیت کی نمائش کرتی ہیں۔ مجھے دو بار ان نمائشوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ تفصیلات بڑی دلچسپ ہیں۔

آیئے ہم ہائیڈرا (Hydra) نامی روبوٹ سے ملیں۔

گرچہ اپنی صورت سے یہ ذرا خوفناک نظر آتا ہے مگر ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ یہ روبوٹ 6 فٹ 11 انچ اونچا انسانی قد و قامت رکھتا ہے۔ یہ اسٹیل، پلاسٹک، المونیم، ربر اور گلاس سے بنا ہے۔ یہ زلزلہ سے تباہ شدہ سرنگوں، پلوں اور زیر زمین تہہ خانوں میں جا کر تباہی کا مشاہدہ کر سکتا ہے اور امدادی ٹیم کو تباہی کی نوعیت بتا سکتا ہے۔ یہ اگر گر پڑے تو دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکتا ہے۔ ACM-R5H ایک ایسا روبوٹ ہے جو ڈیم کی تہہ میں جا کر وہاں جمی کیچڑ کی مقدار کا اندازہ کر سکتا ہے۔ اگر ڈیم میں کہیں سوراخ ہو اور پانی رِس رہا ہو تو یہ اس کی مرمت کر کے ان سوراخوں کو بند کر سکتا ہے۔ اس زمرے کے دوسرے روبوٹ کو ACM-R4.2 کہا جاتا ہے۔ یہ بلند چھجوں پر چڑھ کر ان کا معائنہ کر سکتا ہے، تہہ خانوں کی صفائی کر سکتا ہے اور پرندوں کے گھونسلوں میں داخل کر کے ان کے انڈوں اور بچوں کی تصاویر نکال سکتا ہے۔

جنکن (Janken) نامی روبوٹ کتب اور دستاویز کی تیز

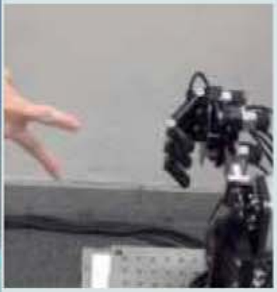

رفتار Scanning اور نقل تیار کرنے کے لیے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ یہ 250 صفحات کی کسی کتاب کی نقل محض ایک منٹ میں نکال سکتا ہے۔ اسے ٹوکیو یونیورسٹی نے تیار کیا ہے۔ یہ انتہائی تیز رفتار اشیا کی بھی تصویر کشی کر سکتا ہے۔ مثلاً اڑتی چڑیا یا دوران میچ ٹینس کی گیند۔

اگر آپ سے کہا جائے کہ کسی مکعب، انڈے یا ڈبے یا گولے کی باہری سطح کا رقبہ دریافت کریں تو آپ چند معروف ریاضی کے فارمولوں کی مدد سے یہ کر سکتے ہیں۔ مگر کسی گڑیا، جج حضرات کی پہنی جانے والی وِگ (Wig) یا کسی آرٹ گیلری میں ایستادہ کسی شاہ کار کا بیرونی سطح کا رقبہ کیسے نکالا جا سکتا ہے؟ اس مقصد کی خاطر ایک دستی روبوٹ محض ان اشیا کے اوپر پھیرے جانے سے ان کی سطح کو Scan کر کے رقبہ دریافت کر سکتا ہے۔

روبوکلین (Robo Clean) نامی روبوٹ سولر پینلوں

پر چڑھ کر ان کی گرد صاف کر سکتا ہے۔ اکثر سولر پینلوں پر جمنے والی گرد ان کی برق پیداواری صلاحیت کو متاثر کر دیتی ہے۔ جاپانی

قومی یوم سائنس

سائنسداں میتن سٹی (Metin Sitti) نے ایک ایسا روبوٹ ایجاد کیا ہے جو گلاس سے ڈھکی عمارتوں پر عمودی چڑھائی چڑھ سکتا ہے۔ یہ گلاس پینلوں سے چپک کر ان کی صفائی کرسکتا ہے۔ دراصل اس کے پہیے گوہ نامی جانور کے پاؤں کی مانند چپکنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ ایک سکنڈ میں 6 مربع سینٹی میٹر علاقہ کی صفائی کرسکتا ہے۔ نمائش میں ایک ایسا روبوٹ بھی تھا جو کسی ماہر کھلاڑی کے ساتھ ٹیبل ٹینس بھی کھیل سکتا تھا۔

اب تو جاپان میں کاشتکاری اور باغ بانی کے لیے بھی روبوٹ استعمال ہونے لگے ہیں۔ یہ زمین میں بیج بو سکتے ہیں، درختوں کی بے ہنگم شاخوں کو تراش سکتے ہیں اور پھلوں کو توڑ کر ان کو سائز کے اعتبار سے ڈبہ بند کرسکتے ہیں۔ کچھ روبوٹ کھاد کی آمیزش سے آبپاشی بھی کرسکتے ہیں۔

فی الحال جاپان کی تجربہ گاہوں میں ایسے روبوٹ بنانے کی تیاری ہے جو انسانوں کی طرح مختلف زبانیں سیکھ سکتے ہیں اور چہرے پر خوشی، غم، تعجب و حیرت اور سوالیہ تاثرات بھی پیدا کرسکتے ہیں اور جملوں کے ساتھ آہ اور واہ بھی جوڑ سکتے ہیں۔ مستقبل کے رجحانات کی پیشین گوئی کرنے والے مصنف شوکن ڈائمنڈ کہتے ہیں کہ یہ بعید نہیں کہ 2021 تک ایسے روبوٹ ایجاد ہوجائیں گے جو ٹوکیو یونیورسٹی سے گریجویشن کی ڈگری لیں گے۔

■

Maqbool Ahmed Siraj
19/1-Mosque Street
3rd Cross, J.C. Nagar
Bangalore - 560006

جوابات

احرار حسین

پروفیسر ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر

شانتی سروپ بھٹناگر 21 فروری 1894 کو پاکستان کے ضلع شان پور کے ایک مقام میرا میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد صاحب کا نام پرمیشوری سہائے تھا۔جب آپ آٹھ مہینے کے ہی تھے آپ کے والد صاحب کا انتقال ہوگیا۔گھر کے حالات اچھے نہیں رہے اور خاندان کو غربت کے دن گزارنا پڑے۔شانتی سروپ کے ایک بہن اور ایک بھائی بھی تھے۔ بگڑتے حالات کی وجہ سے آپ کی والدہ نے سکندر آباد اترپردیش اپنے والد صاحب کے گھر جانا پسند کیا۔شانتی سروپ اوران کے بھائی بہن کی پرورش ان کے نانا صاحب کے زیرنگرانی ہونے لگی۔ابتدائی تعلیم سنہ 1909 سے شروع ہوئی۔اس کے بعد سکندر آباد کے ای۔وی ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کرنے میں مصروف ہوئے۔اسکول کے ہیڈ ماسٹر لالہ رگھوناتھ سہائے کی سفارش سے لاہور کے دیال سنگھ اسکول میں بھی داخلہ دلایا گیا۔ ہیڈ ماسٹر رائے نے شانتی سروپ کی صلاحیتوں کو محسوس کیا۔وہ جانتے تھے کہ اگر شانتی سروپ کی صحیح رہنمائی کی جائے تو شانتی سروپ ایک اچھے تعلیم یافتہ انسان ثابت ہوسکتے ہیں۔شانتی سروپ نے سنہ 1911 میں میٹرک پاس کیا۔اپنی تعلیم کے سارے اخراجات وہ اپنی اسکالرشپ سے پورا کرتے تھے۔شانتی سروپ کی دلچسپی ویسے تو سب ہی مضامین میں تھی۔لیکن وہ علم طبیعیات اور علم ریاضی میں خصوصی دلچسپی رکھتے تھے۔آپ تجربات میں یقین رکھتے تھے اور چھوٹے چھوٹے سائنس کے تجربات اسکول میں ہی کیا کرتے تھے۔اسکول کے زمانے میں ہی آپ نے سیل میں استعمال آنے والی الیکٹراڈ کا بدل تیار کرنے میں کامیابی حاصل کرلی تھی۔میٹرک کے امتحان میں اچھے نمبر حاصل کرنے کی وجہ سے وظیفہ ایک مرتبہ پھر مل گیا اور انھوں نے دیال سنگھ کالج لاہور میں داخلہ لے لیا۔1913 میں انٹرمیڈیٹ اوّل درجہ میں پاس کیا۔شانتی سروپ نے لاہور کے فارمین کرسچین کالج میں

بی ایس سی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے داخلہ لیا اور سنہ 1916 میں بی ایس سی کا امتحان اچھے نمبروں میں پاس کیا۔

شانتی سروپ بھٹناگر اسکول کی تعلیم کے علاوہ سائنسی مطالعہ میں بھی مصروف رہتے تھے۔ اور سائنس کی نئی نئی ایجادات سے بھی باخبر رہتے تھے۔ وہ اپنی والدہ اور بھائی بہن سے متعلق ذمہ داریوں کو اچھی طرح محسوس کرتے تھے۔ ان کو یہ احساس ستاتا تھا کہ اسکالرشپ کی آمدنی سے اپنے گھر کی ضروریات پوری کرنا ناممکن ہے۔ اس لیے وہ کرسچین کالج کے شعبۂ طبیعیات میں ڈیمانسٹریٹر کی جگہ پر کام میں مصروف ہوئے۔ شانتی سروپ ہر کام محنت اور لگن سے کیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے دیال سنگھ کالج کے شعبۂ طبیعیات سے سینئر ڈیمانسٹریٹر کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع فراہم کیا۔ آپ اس ذمہ داری کے ساتھ ساتھ ٹیوشن بھی کیا کرتے تھے اور اپنی تعلیم کو بھی جاری رکھتے تھے۔ سنہ 1919 میں آپ نے ایم ایس سی کی تعلیم مکمل کی۔ آپ کو علم طبیعیات کے علاوہ فزیکل اور اِن آرگینک کیمسٹری میں بھی مہارت حاصل تھی۔ آپ سائنسی تجربات کیا کرتے تھے اور سائنس کے فروغ کے لیے کوشاں تھے۔ آپ نے ایک مرتبہ لندن کی ایک کمپنی کے لیے اپنی خدمات دیں اور جو معاوضہ کمپنی نے ان کو دیا۔ اس کو آپ نے پنجاب یونیورسٹی کو دے دیا تاکہ سائنسی تجربہ گاہوں کو بہتر سے بہتر بنایا جاسکے اور سائنسی تحقیق کے لیے ان کا استعمال کیا جاسکے۔ شانتی سروپ نے اس درمیان کئی تحقیقی پرچے بھی لکھے جو مختلف سائنسی جریدوں میں شائع بھی ہوئے۔ سنہ 1943 میں رائل سوسائٹی لندن نے آپ کو سوسائٹی کی رکنیت سے نوازا۔ اسی دوران آپ کی ملاقات وائسرائے لارڈ لنتھ گان سے لاہور میں ہوئی۔ لارڈ لنتھ گان شانتی سروپ کی تجربہ گاہ دیکھنے آئے اور ان کی سائنسی تحقیق اور تجربہ گاہ سے کافی متاثر ہوئے۔ انھوں نے شانتی سروپ کو بورڈ آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ میں شامل کیا۔ سنہ 1942 میں شانتی سروپ کونسل آف سائنٹفک انڈسٹریل ریسرچ کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے فائز ہوئے۔ اس طرح آپ لاہور سے دہلی تشریف لے آئے۔ آپ کے زیرنگرانی سی ایس آئی نے دن دونی رات چوگنی ترقی کی۔ آپ کی شہرت اور قابلیت سے سب ہی لوگ باخبر تھے۔ اسی دوران آپ کی ملاقات پنڈت نہرو اور مولانا آزاد سے بھی ہوئی۔ یہ دونوں سیاست داں ملک میں سائنس اور تکنیک کے فروغ کے لیے کوشاں تھے۔ شانتی سروپ کی خدمات کو دیکھتے ہوئے ان کی مدد بھی لی گئی تاکہ ملک کے مختلف حصوں میں قومی سائنس تجربہ گاہ کا قیام کیا جاسکے۔ اس سلسلے کی ایک تجربہ گاہ سنہ 1950 میں پونا میں نیشنل کیمیکل لیبوریٹری کے نام سے بنائی گئی۔ آپ تحقیقی کاموں کے لیے لندن تشریف لے گئے اور وہاں پر لندن یونیورسٹی میں پروفیسر ڈونن کے زیرنگرانی تحقیقی کام بھی کیا۔ آپ کا یہ تحقیقی کام ان ورجن آف ایملشن پر تھا۔ اس تحقیقی کام پر آپ کو سنہ 1961 میں لندن یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف سائنس کی ڈگری سے نوازا۔ آپ اپنے ملک سے بے حد پیار کرتے تھے۔ اسی لیے آپ ہندوستان واپس آگئے اور بنارس یونیورسٹی میں شعبۂ کیمیا میں پروفیسر کی حیثیت سے مصروف ہوئے اور اس شعبہ کی سربراہی بھی کی۔ سنہ 1964 میں آپ پنجاب یونیورسٹی کی یونیورسٹی کیمیکل لیباریٹری کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے تشریف لے آئے۔ آپ کی رہنمائی میں اس تجربہ گاہ میں اعلیٰ پیمانے کی

تحقیق کی گئی اور بہت سے شاگرد پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس تجربہ گاہ میں زیادہ تر تحقیقی کام میگنیٹو کیمسٹری (Magnetochemistry) اور املشن (Emulsion) پر کیا گیا۔ ڈاکٹر شانتی سروپ نے بہت سے ہونہار شاگردوں کو اس لائق بنایا کہ وہ اپنے ملک کے مختلف حصوں میں جا کر ملک اور علم کیمیا کی خدمت کر سکیں۔ آپ نے انڈین نیشنل سائنس اکیڈمی کا قیام دہلی میں کیا۔ آپ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے چیئرمین بھی رہے۔

آپ نے یونیورسٹیز کی فلاح اور معیار کے فروغ کے لیے کوشش کی۔ ہندوستان کی ایٹامک انرجی کمیشن کے ممبر سکریٹری بھی رہے۔ اور ملک کی ایٹامک انرجی کی ضروریات کے لیے بہت سے مراکز قائم کرنے اور عمل میں لانے میں مدد بھی کی۔ ڈاکٹر بھٹناگر ہندوستان کے ان سائنسدانوں میں تھے جو ملک اور قوم کی ترقی میں یقین رکھتے تھے۔ وہ نہ صرف ایک اچھے استاد ہی تھے بلکہ ایک اچھے سائنسداں، دور اندیش اور ایڈمنسٹریٹر بھی تھے۔

پروفیسر بھٹناگر کو ہندوستان کے سرفہرست سائنس دانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کو ہندوستان میں سائنسی تحقیق، سائنسی مراکز اور سائنس کے فروغ کے معمار کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔ آج ہندوستان سائنس کے شعبوں میں جس قدر ترقی کر چکا ہے اس کا سہرا ڈاکٹر بھٹناگر کو ہی جاتا ہے۔ ڈاکٹر بھٹناگر 31 دسمبر 1954 کو دل کا دورہ پڑنے کے سبب انتقال فرما گئے۔ ہندوستان اور دنیا بھر کی سائنس برادری ان کی خدمات کو بھلا نہیں پائے گی اور ہمیشہ یاد رکھے گی۔ ■

ماخذ: عظیم سائنس داں، **مصنف:** احرار حسین، **دوسری طباعت:** 2010، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

نسیم سعید

اے ٹی ایم

ایک زمانہ تھا جب بینکوں سے رابطہ رکھنا باعثِ فخر سمجھا جاتا تھا۔ امیروں میں شمار ہونا اور سماج میں اپنی امیری کی دھاک جمانا سمجھا جاتا تھا۔ لیکن آج بینک سے تعلق رکھنا ہر ایک کی بنیادی ضرورت ہے۔ زیادہ تر لین دین میں بینک سے رابطہ آج ہر ایک کے لئے عام بات ہے۔ حکومتی اسکیمیں ہوں، وظائف کا معاملہ ہو یا پھر تجارتی اور کاروباری حساب۔ فلاحی یا امدادی تنظیمیں ہوں یا پھر آفسوں کی تنخواہوں کی ادائیگی۔ بغیر بینک کے اکاؤنٹ نمبر سے یہ سب اب ممکن نہیں رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بینکوں کے اندر اب گراہکوں کو پیر رکھنے کی جگہ نہیں رہی۔ بینکوں کے باہر بھی لمبی لمبی قطاریں اور وقت کی بربادی کے ساتھ ساتھ لوگوں کے روزانہ کے معمولات پر بھی اب اثرات مرتب ہونے لگے ہیں۔ بچوں، نوجوانوں، خواتین اور ضعیف افراد ہر ایک کو مشکلات کا سامنا کرنا مقدر بن گیا۔ مگر یہ سچ ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ تقدیر بھی محنت، لگن اور حوصلہ کی بلندی کے آگے جھک جاتی ہے۔ کچھ ایسا ہی جان شیفرڈ بیرن (John shepherd-Barron) کے ساتھ ہوا۔

بات سال 1965 کی ہے۔ جب ایک دن جان شیفرڈ بیرن کو پیسوں کی فوری سخت ضرورت تھی۔ اُسی مقصد کی تکمیل کے تحت وہ اپنے مطلوبہ بینک پہنچے۔ مگر اس وقت ایک منٹ کی تاخیر ہوگئی تھی۔ بینک کا کاروبار بند ہوگیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلسل جدوجہد کے باوجود انہیں مطلوبہ پیسہ نہیں مل سکا۔ اس کے بعد سے ہی وہ اس تعلق سے بے چین اور فکرمند ہوگئے۔ اُن کے ذہن میں چاکلیٹ نکالنے والی مشین کا تصور آیا۔ یہیں سے یہ خیال بھی آیا کہ جب ضرورت کے وقت ہم اپنی پسند کی چاکلیٹ مشین سے حاصل کر سکتے ہیں تو اپنا پیسہ کیوں نہیں۔ جب ہم چاہتے ہیں تو یہ مشین ہماری پسندیدہ چاکلیٹ فراہم کردیتی ہے۔ بالکل اس طرح کی مطلوبہ پیسہ فراہم کرنے والی مشین ایجاد ہونی چاہیے۔ جس سے 24 گھنٹے نقد رقم ہم نکال

سکتے ہیں۔ اگر ایسا ممکن ہوا تو ہم سب کو ان گنت مشکلات سے نجات پانا طے ہے۔ وقت و صحت کی بربادی سے رُکنا ممکن ہے۔ بیرن کی اس سلسلے پر انتھک محنت اور جدوجہد جاری رہی۔ یہ مشین سخت محنت کے بعد 1967 میں وجود میں آئی۔

اس کی ایجاد و دریافت کا سہرا اسکاٹ لینڈ (Scotland) کے جان شیفرڈ بیرن کے سر بندھتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ دُنیا بھر میں ATM مشین کے ذریعے لوگوں کو بینک کی لمبی لمبی قطاروں سے نجات دلانے والے جان شیفرڈ بیرن کی پیدائش 23 جون 1925 کو شیلانگ (میگھالیہ کی راجدھانی) میں ہوئی تھی۔ اس وقت اُن کے اسکاٹش والد ولِ فرڈ شیفرڈ بیرن (Wilfred Shepherd-Barron) چٹگام فورٹ کمشنرس کے چیف انجینئر تھے۔ بیرن کی وفات سال 2010 میں ہوئی جب وہ 84 برس کے تھے ۔ بیرن ATM کا پن (PIN) چھ ہندسوں میں کرنے کے حامی تھے۔ لیکن اُن کی چہیتی بیوی نے اُن سے کہا کہ چھ ہندسے زیادہ ہیں ۔ لوگ اُسے یاد نہیں رکھ پائیں گے۔ اس وجہ سے انہوں نے ATM کا چار ہندسوں کا پن بنایا۔ آج بھی چار ہندسوں والے پن کے استعمال کا ہی رواج ہے۔ نقد نکالنے والی پہلی ATM ستائیس جون 1967 میں لندن کے بارکلیز بینک (Barclays Bank) نے لگائی تھی۔ یہ مشین سخت محنت کے بعد اسکاٹ لینڈ کے دریافت کردہ جان شیفرڈ بیرن نے تیار کی تھی۔ آج ATM کی خدمت دُنیا کی سب سے بڑی Cash Point Service بن گئی ہے۔ اعداد و شمار کے مطابق آج دُنیا میں تیس لاکھ سے زیادہ ATM کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں 1987 میں پہلا ATM لگایا گیا تھا۔ اسے ہانگ کانگ اینڈ سنگھائی بینک کارپوریشن لمیٹیڈ (HSBC) نے ممبئی میں واقع اپنی شاخ میں قائم کی تھی۔ حالیہ دنوں میں ہمارے ملک میں ایک لاکھ لوگوں پر قریب بیں ATM ہیں ۔ جب کہ عالمی سطح پر ایک لاکھ آبادی پر ATM کی تعداد 40.50 ہے۔

ATM ایک طرح کا Data Terminal ہوتا ہے۔ جس میں Key board, Mouse Monitor جیسے اِن پُٹ (input) اور آؤٹ پٹ (Out put)، آلات (Devices) ہوتے ہیں۔ یہ Host Processor سے ربط ہوتا ہے۔ جو بینک اور ATM کے درمیان کڑی کا کام کرتے ہیں۔ اس کے لئے انٹرنیٹ کی مدد لی جاتی ہے۔ اس سے مشین میں کارڈ داخل کرتے ہی وہ بینک کے Host Processor سے جڑ جاتا ہے۔ اس طرح سے ہم بغیر بینک جائے ہی اپنے کھاتے سے پیسہ نکال سکتے ہیں۔ ہر گراہک کے

Debit یا Credit کارڈ کے پچھلے حصے میں ایک خاص Magnetic strip ہوتی ہے۔ جس میں اُس کی شناخت کی تعداد (Identification Number) اور دوسری معلومات کوڈ (Code) کی صورت میں ہوتی ہے۔ جب ہم کارڈ کو ATM کے Card Reader میں داخل کرتے ہیں تو اے ٹی ایم Magnetic strip میں چھپی (Print) ہوئی ان معلومات کو پڑھ لیتا ہے۔ یہ معلومات جب (Proscessors) کے پاس پہنچتی ہے تو وہ ہمارے بینک سے Transaction کا راستہ صاف کرتا ہے۔ جب ہم نقد نکالنے کا متبادل منتخب کرتے ہیں تو Host processor اور ہمارے بینک اکاؤنٹ کے درمیان ایک Electronic fund Transfer Reaction ہوتا ہے۔ اس ردِّ عمل (Reaction) کے مکمل ہوتے ہی Host Processor اے ٹی ایم کو ایک Approval code ارسال کرتا ہے۔ یہ کوڈ ایک طرح سے مشین کو پیسہ دینے کا حکم جاری کرتا ہے۔

اس کی تواریخ پر مزید غور کریں تو دراصل 1920 میں نیو یارک کے فرسٹ نیشنل سٹی بینک (First National city bank) نے اپنی کئی شاخوں پر Bankograph machine install کی۔ یہ مشین ATM جیسی ہی تھی۔ لیکن اس سے پیسے نہیں نکلتے تھے۔ اس مشین سے لوگ اپنے Utility بل کی ادائیگی کرتے تھے اور رسید حاصل کر لیتے تھے۔ اس مشین سے کیشیئر (Cashier) کا رول ختم ہو گیا تھا۔ 1967 میں بار کلیز بینک کی ایک شاخ نے دُنیا کا پہلا نقد فراہم کرنے والا ATM لگا جو کہ Cash machine Dispenser کہلائی۔ یہ مشین Voucher کے ذریعے نقد کی ادائیگی کرتی تھی۔ جو پہلے سے بینک کی شاخ سے حاصل کیا جا سکتا تھا۔ اسے برطانوی کمپنی De La Rue کے آلات (Instruments) کی مدد سے بنایا گیا تھا۔ 1968 میں بارکلیز اور دوسرے بینکوں نے ایک ایسا ATM لگایا جس میں پیسہ نکالنے کے لیے کارڈ کا استعمال کرنا ہوتا تھا۔ یہ کارڈ بینک سے پہلے لینا ہوتا تھا۔ ایک کارڈ ایک بار مشین میں ڈالنے پر

باہر نہیں آتا تھا اور ہر بار نئے کارڈ کا استعمال کرنا ہوتا تھا۔ اس لیے اسے Card eating Machine کہا جاتا تھا۔

دلچسپ اور مزیدار بات یہ ہے کہ اسٹیٹ بینک آف انڈیا نے سال 2004 میں دُنیا کا پہلا تیرتا ہوا ATM نصب کیا تھا۔ اس اے ٹی ایم کو کوچی سے وائی پین کے درمیان چلنے والی جھنکار فیری بوٹ (Jhankar ferry boat) پر نصب کیا گیا تھا۔ یہ بوٹ روزانہ پانچ ہزار سے زیادہ سیاحوں کو سیر کراتی ہے۔ جس وقت یہ ATM اُس بوٹ میں لگایا گیا تھا، اسے لے کر سیاحوں میں زبردست جوش تھا۔ پاکستان کے قومی بینک نے بھی کھنجراب درّہ پر ATM کو لگا کر ایک نیا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ 15397 فٹ کی بلندی پر واقع یہ دُنیا کے سب سے بلند مقام پر واقع ATM ہے۔ اس سے قبل یونین بینک آف انڈیا نے سال 2007 میں سکّم میں 14300 فٹ کی بلندی پر ATM نصب کیا تھا۔ اسے بھی دُنیا کے اونچے مقام پر نصب ATM میں شمار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح سے انٹارکٹکا میں واقع ATM کو دُنیا کا سب سے دُور مقام والا ATM تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ ATM امریکی انٹارکٹک ریسرچ سینٹر میک مُرڈو اسٹیشن American Antarctic Research Centre Meckmurdo station پر واقع ہے۔ اس مشین کی دیکھ بھال اور نگرانی امریکی بینک wales Farg کرتی ہے۔ یہ ATM قریب 12875 کلومیٹر جنوبی سمت کی طرف جانے پر ملتا ہے۔ یہاں پر دو ATM ہیں۔ تاکہ اگر ایک خراب ہو جائے تو اُسے درست کرنے کے لیے میکانک کو بُلانے کا وقت رہے۔

آج ATM سے صرف پیسے ہی نہیں بلکہ سونا (Gold) بھی نکال سکتے ہیں۔ گولڈ پلیٹ (Go- Plate) نکالنے والی پہلی مشین ابوظہبی کے امارات پیلس ہوٹل (Amirat Palace Hotel) کی لابی میں نصب کی گئی ہے۔ اس سے 320 طرح کے سونے کی اشیا نکالی جاسکتی ہیں۔ یورپ کے ملک رومانیہ میں بغیر بینک کھاتے کے بھی ATM کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح کی سہولت دینے کا یہاں کے بینکوں میں رواج عام ہے۔ حالاں کہ ہندوستان سمیت کئی ملکوں میں ابھی اس طرح کی سہولت میسر نہیں ہے۔ برازیل میں Banking Transaction اور Password کو زیادہ محفوظ بنانے کے لیے بایومیٹرک (Biometric) ATM کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ان ATM پر گراہک کا پہلے Finger Scan کرنا ہوتا ہے۔ اب ایسے ATM ہمارے ملک ہندوستان میں بھی جلدی ہی قائم ہوسکتے ہیں۔

جہاں عوامی فلاح و بہبود کے لیے آج ہر نئی تکنیک کا استعمال ہو رہا ہے۔ وہیں غلط سوچ رکھنے والے افراد اس کے نقصان کے درپے ہیں۔ آج ATM کو توڑنا اور لوٹنا بھی ذرائع نشرو ابلاغ میں عام بات ہے۔ لہٰذا ATM کی حفاظت کے تحت اُس کے اندر جس جگہ پر نوٹ رہتے ہیں۔ وہاں پر ایک نیلی سیاہی والی بوتل رہتی ہے۔ کوئی زبردستی نوٹ نکالنے کی کوشش کرتا ہے یا پھر مشین کو توڑتا ہے تو یہ سیاہی نوٹ پر خود بخود پھیل جاتی ہے۔ اس طرح کے کئی اقدامات تحفظ کی غرض سے کیے جا رہے ہیں۔

■

Naseem Sayeed
PlotNo: 27, Haji Nagar
New Yerkheda
Kamptee - 441001 (Maharashtra)

مہروز فاطمہ

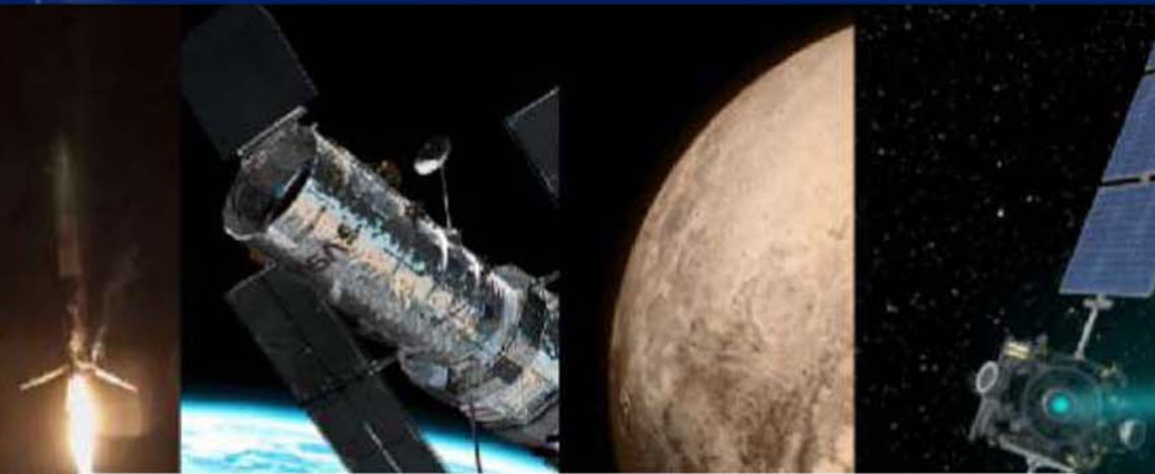

سائنس کے میدان میں ہندوستان کی کامیابی حیران کن!

سائنس کے میدان میں ترقی یافتہ ملکوں میں ہندوستان کا بھی شمار ہوتا ہے۔ اس کی ترقی دنیا بھر کے لوگوں کے لیے حیران کن ہے لیکن ہندوستان کے لوگوں کے لیے خوش آئند ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستان کے معماروں کی یہ خواہش تھی کہ ان کا ملک سائنس کے میدان میں پرچم لہرائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے بمبئی، مدراس، کانپور اور دلی میں دی انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی، جسے مختصراً آئی آئی ٹی کہا جاتا ہے، قائم کیے گئے۔ ہندوستان کے سائنس داں دوسری عالمی جنگ کے دوران اور بعد کے حالات سے واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہندوستان کو ترجیحی بنیاد پر کون سا کام پہلے کرنا ہے، چنانچہ آزادی کے 26 برس ہی ہوئے تھے کہ ہندوستان نے 18 مئی 1974 کو اپنے پہلے ایٹم بم کا ٹیسٹ کیا۔ یہ ٹیسٹ پوکھران میں ہوا۔

امریکہ اور سوویت یونین اسپیس سائنس پر توجہ دے رہے تھے۔ وہ چاند پر آدمی بھیجنا چاہتے تھے، نئی دنیا کی تلاش کرنا چاہتے تھے۔ ہندوستان کے دونوں ہی ملکوں سے اچھے تعلقات تھے لیکن اس نے سوویت یونین کی مدد سے اسپیس پروگرام آگے بڑھانے کا تہیہ کیا۔ 1962 میں ڈپارٹمنٹ آف اٹامک ایزجی کے تحت 'دی انڈین نیشنل کمیٹی فار اسپیس ریسرچ' قائم کی گئی۔ اس کے پہلے چیئرمین مشہور سائنس داں وکرم سارا بھائی بنائے گئے۔ 15 اگست 1969 کو 'اِسرو' قائم ہوا۔ اس کا پورا نام 'انڈین اسپیس ریسرچ آرگنائزیشن' ہے۔ اس کے قیام میں، اسے آگے بڑھانے میں وکرم سارا بھائی نے بے حد اہم رول ادا کیا۔

2019 میں اِسرو نے قیام کے 50 برس مکمل کر لیے۔ ان 50 برسوں میں اس کی کامیابی شاندار رہی ہے۔ اس کا شمار آج دنیا کے 5 بہترین اسپیس سینٹروں میں ہوتا ہے۔ یہ ادارہ اپنے ملک کے بھی سیٹیلائٹ لانچ کرتا ہے اور دیگر ملکوں کے بھی۔ اِسرو کو قائم ہوئے 15 سال ہی ہوئے تھے کہ وہ سوویت یونین کے اسپیس سینٹر کے اشتراک سے پہلے ہندوستانی شہری

راکیش شرما کو اسپیس میں بھیجنے میں کامیاب رہا۔ سائنس کے میدان میں یہ ہندوستان کی بڑی کامیابی تھی۔ اس کے بعد پے در پے اِسرو کامیابیاں حاصل کرتا چلا گیا۔ اِسرو نے 'چندریان-I' لانچ کیا، اس کے بعد اس نے 'چندریان-II' لانچ کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اسپیس سائنس میں اس کی کامیابیوں کی فہرست بہت لمبی ہے۔ آج اِسرو جیسے ادارے اور ہندوستانی سائنس دانوں کی کوششوں سے ہندوستان اس مقام پر پہنچ گیا ہے جہاں تک پہنچنا ہر ملک چاہتا ہے۔ ہندوستان کا شمار ان چند ملکوں میں ہوتا ہے جو سائنس کے میدان میں بہت آگے ہیں۔

واجپئی کا نعرہ 'جے وگیان'

ہندوستان کے وزیراعظم لال بہادر شاستری نے 'جے جوان جے کسان' کا نعرہ دیا تھا۔ وہ اس نعرے کے توسط سے بتانا چاہتے تھے کہ ملک کی تعمیر میں اپنے رول سے جوان اور کسان واقف ہوں۔ بعد میں وزیراعظم بننے کے بعد اٹل بہاری واجپئی نے اس نعرے میں 'جے وگیان' بھی جوڑ دیا تاکہ ہندوستان کے لوگ یہ سمجھیں کہ اس دور میں سائنس کی بہت اہمیت ہے۔ واجپئی کے سائنس پر خصوصی توجہ دینے سے یہ ہوا کہ سائنس کے میدان میں ہندوستان کے لوگوں کی کامیابیوں کی رفتار تیز ہوگئی۔

کلام کا خواب

ہندوستان کے سابق صدر اے پی جے عبدالکلام کا کہنا

تھا کہ 'خواب وہ نہیں ہیں جو آپ سوتے ہوئے دیکھتے ہیں بلکہ وہ ہیں جو آپ کو سونے نہ دیں۔' وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کے بچے اپنی اہمیت کو سمجھیں اور سائنسی مزاج بنائیں۔ وہ آخر آخر تک اس بات کے لیے کوشاں رہے کہ ہندوستان سائنس کے میدان میں تیزی سے ترقی کرے۔ دراصل بنیادی طور پر وہ ایک سائنس داں تھے۔ انھوں نے پوری زندگی ہندوستان کو مستحکم بنانے میں گزار دی۔ انھیں 'پیپلز پریسیڈنٹ' اور 'میزائل مین' کہا جاتا ہے۔

چندریان-I اور چندریان-II

اِسرو نے چاند کے بارے میں نئی معلومات حاصل کرنے کے لیے 'چندریان-I' بھیجا۔ یہ کامیاب رہا۔ اس کی وجہ سے کئی بیش قیمتی تصویریں ملیں اور سب سے اہم بات یہ ہوئی کہ ہندوستان میں اسپیس سائنس لوگوں کی گفتگو کا موضوع بنا، بچوں میں چاند، خلا اور دیگر سیاروں کے حوالے سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ 11 سال کے اندر ہندوستان نے 'چندریان-II' بھی لانچ کیا۔ یہ مشن مکمل کامیابی سے ذرا سا چوک گیا مگر بڑی حد تک کامیاب رہا لیکن سائنس دانوں نے ہمت نہیں ہاری ہے۔

■

Mahroz Fatima
C/o Jahazi Kothi
Mohalla Kamra

سید بشیر احمد بشیر سولاپوری

آپ اگر بن جائیں قابل

نظم

آپ اگر بن جائیں قابل
آساں ہوگی بچو! منزل
روپیہ پیسا نہیں ضروری
کوشش گر ہو آپ کی پوری
آپ کلکٹر بن سکتے ہیں
چاہیں ڈاکٹر بن سکتے ہیں
انجینئر بن سکتے ہیں
اعلیٰ افسر بن سکتے ہیں
چیف منسٹر بن سکتے ہیں
قوم کے رہبر بن سکتے ہیں
سب سے ہٹ کر بن سکتے ہیں
سب سے برتر بن سکتے ہیں
جو رکھے مضبوط ارادہ
خواب اسی کا ہوگا پورا

■

Syed Bashir Ahmed Bashir
Darus Salam Residency
7th Floor, 708, Near Pangal
Urdu High School
Siddheshwar Peth, Solapur - 413001 (MS)

محمد رفیع انصاری

دادا کی پوتی

تھوڑی سی پتلی، تھوڑی سی موٹی دادا کی پوتی
درجے میں اپنے تھوڑی سی چھوٹی دادا کی پوتی

رستہ چلے تو پہلو بدل کے
اسکول پہنچے گرتے سنبھلتے
بستے میں اس کے بیسن کی روٹی دادا کی پوتی

باتوں میں اس کے کیسی روانی
سب کو سنائے 'ہارر کہانی'
تھوڑی سی سچی، تھوڑی سی جھوٹی دادا کی کہانی

امی سے جھگڑا، ابو سے یاری
دادی سے جیتی، دادا سے ہاری
اُس کو نہ بھائے بجلی کٹوتی دادا کی پوتی

اس کا موبائل ٹوٹا ہے جب سے
شکوہ ہے گھر سے، روٹھی ہے سب سے
نانی سے مانگے پیلی انگوٹھی دادی کی پوتی

انگریزی اسکول میں پڑھنے والی
اردو زباں کا دم بھرنے والی
لفظوں میں رولے چمکیلے موتی دادا کی پوتی

■

Mohd Rafi Ansari
'Al-Madni Complex',
734, Bhoosar Mohalla
Bhiwandi - 421308, Thane (Maharashtra)

مہدی پرتاپ گڑھی

گفتگو جمورے سے

اگو بگو ببے بول
بول جمورے لب تو کھول
مانا ہے یہ دنیا گول
تو بھی تو ہے گول مٹول
اپنے مَن کی کھڑکی کھول
کر نہ زیادہ ٹال مٹول

—

سب کے دل بہلاتا ہے
ہنستا اور ہنساتا ہے
لیکن تیرے دل کا حال
کب کھلتا ہے پیارے لال
تو نے اپنے چاروں سمت
بن رکھا ہے ایسا جال

کتنے ایسے ہیں انسان
درد و غم سے ہیں ہلکان
تو اپنے ہنس گلوں سے
کرتا رہتا خوشیاں دان
ان کا درد مٹاتا ہے
ہے یہ تیرا کام مہان

—

اپنے زخم چھپاتا ہے
ہنسی کا دیتا پردہ ڈال
کبھی تو اپنا بھی غم بانٹ
ظاہر کردے دل کا ملال
سب کو خوشیاں بانٹنے والے
تو بھی خوش رہ پیارے لال

■

Medh Partapgarhi
28, School Ward
Partapgarh - 230001 (UP)

جوابات (اردو زبان کا جادو)

(7) ساتھیوں کی سیڑھی

ص	ث	چ	ع	ڈ	ظ
ت	ڑ	ش	گ	غ	ج

ماخذ: اردو زبان کا جادو (پارٹ 1)، ادارہ، سنہ اشاعت: تیسری طباعت 2009، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

طارق محمود مرزا

تھائی لینڈ کے سفر کا دلچسپ حصہ

یہ بنکاک کی سیاحت کا ہمارا دوسرا دن تھا۔ پورے دن کے مسلسل سفر کے بعد ہم شام کے وقت ہوٹل لوٹے تو آرام دہ بستر بہت راحت افزا لگا۔ مگر ابھی ہمیں شام کے کھانے کی تلاش میں نکلنا تھا۔ تھوڑی دیر آرام کرنے اور شاور لینے کے بعد تازہ دم ہوکر ہم کھانے کی تلاش میں نکل پڑے۔ جی ہاں کھانے کی تلاش! ایسے ملک میں جہاں آپ اجنبی ہوں تو کھانا آپ کو باقاعدہ تلاش کرنا پڑتا ہے۔ اس تلاش کی پہلی شرط یہ ہوتی ہے کہ حلال ہو۔ دوسرا یہ کہ لذیذ ہو۔ تیسرا یہ کہ مضرِ صحت نہ ہو۔ چوتھا یہ کہ دیسی ذائقہ حامل ہو۔ پانچواں یہ کہ وہاں کا ماحول اچھا ہو اور چھٹا یہ کہ بجٹ کی حد میں ہو۔ اب اتنی ساری شرائط کے ساتھ آپ کسی ایسے ملک کے بازار میں جاتے ہیں جس کے بارے میں آپ کچھ نہ جانتے ہوں، جس شہر میں آپ اجنبی ہوں اور شہر آپ کے لیے اجنبی ہو، ان حالات میں گوہرِ مقصود حاصل ہوجائے تو یہ آپ کی خوش قسمتی ہوگی۔ سیاحوں کو ایسا گوہر بہت کم نصیب ہوتا ہے۔ سیاح جسے ہیرا سمجھتے ہیں وہ اکثر پتھر نکلتا ہے۔ گزشتہ رات ہمارے ساتھ ایسا ہو چکا تھا، ہم ایک ایسی اُونچی دُکان میں جا گھسے تھے جس کا پکوان پھیکا تھا۔ جتنی دیر میں شہر کے بازاروں، دکانوں اور ماحول سے یگانگت پیدا ہوتی ہے، سیاح اگلی منزل کی جانب روانہ ہوجاتا ہے۔ اکثر اس کا علم، مشاہدہ اور تجربہ نہاں خانۂ دل میں رہ جاتا ہے اور کسی کے کام نہیں آتا۔ یا پھر مجھ جیسے قلم گھسیٹنے والوں کو تحریر کے لیے کچھ مواد میسر آجاتا ہے۔ ویسے سیاحوں کے تجربات و مشاہدات سے مستفید ہونا چاہیے۔ کیونکہ تجربے اور مشاہدے کا نعم البدل کوئی نہیں ہے۔

بنکاک کا ٹرمینل 21 اور پروفیسر جونز سے ملاقات

اس مرتبہ ہم نے بازاروں میں گھومنے کی بجائے اس علاقے کے ایک عظیم الشان شاپنگ مال ٹرمینل 21 میں جانے کا پروگرام بنایا۔ یہ شاندار پلازہ ہمارے ہوٹل سے صرف پانچ منٹ کی دوری پر تھا۔ ٹرمینل 21 کی اکیس منزلہ عمارت میں چھ سو سے زائد دُکانیں اور سینکڑوں ریستوران ہیں۔ اس شاندار عمارت کی تعمیر اس طرح کی گئی ہے کہ اس کے بے شمار کونے ہیں۔ اس کی مختلف منزلوں پر مختلف بین الاقوامی شہروں، اس کی اہم عمارتوں اور اس کے مشہور اسٹور اور ریستوران کے نمونے موجود ہیں۔ ان شہروں میں لندن، ٹوکیو، استنبول، سان فرانسسکو اور پیرس شامل ہیں۔ لندن والے فلور پر ٹاور آف

لندن کا دھاتی نمونہ اس کے مشہور برانڈ کے اسٹورز اور وہاں کے ریستوران کی شاخیں موجود ہیں۔اسی طرح دوسرے فلورز پر دوسرے شہروں کی اہم اشیا دستیاب ہیں۔ٹرمینل 21 میں کئی فلور صرف ریستورانوں پر مشتمل ہیں۔ہم باری باری اُن میں گھومتے رہے۔ ہماری تلاش ایک کونے میں واقع سی فوڈ یعنی سمندری کھانے والے ریستوران میں جاکر ختم ہوئی۔ اگر پاکستانی ریستوران مل جاتا تو زیادہ بہتر تھا۔تاہم یہ سمندری کھانا بھی ہمیں بہت بھایا۔

ٹاور کی تیرہویں منزل پر واقع اس ریستوران میں ہماری میز ایک کونے میں تھی۔ ہمارے دونوں اطراف شیشے کی دیواریں تھیں جو محسوس نہیں ہوتی تھیں۔ بلکہ یوں لگتا تھا کہ آپ فضا میں بلند ایک اُڑن کھٹولے میں بیٹھے ہیں اور آپ کے نیچے مصروف سڑکوں پر گاڑیاں اور لوگ چلے جارہے ہیں۔اس بلندی سے دور دور تک بنکاک کی بلند و بالا عمارتیں،مصروف شاہراہیں، پُرپیچ گلیاں، بازار، بل کھاتا دریا اور بھاگتی ہوئی ریل نظر آتی تھی۔ اس وقت بنکاک روشنیوں اور رنگوں کا شہر نظر آتا تھا۔ بڑی بڑی عمارتیں پوری طرح روشن تھیں۔سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر روشنیاں رقصاں تھیں۔حتیٰ کہ کشتیوں اور کناروں کی روشنی سے دریا کا پانی بھی روشنیوں اور رنگوں میں نہایا نظر آتا تھا۔ بنکاک پرامن، ترقی یافتہ اور دنیا بھر کے سیاحوں میں مقبول شہر ہے۔ اس وقت اس شہر کی رونقیں جوان تھیں۔نوجوان جوڑے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے عشرت کدوں کا رخ کررہے تھے۔ ہوٹل، کلب، ریستوران اور دوسری تفریح گاہیں آباد تھیں۔لوگ ان کی جانب کھنچے چلے آرہے تھے۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں اٹھکیلیوں میں مصروف تھے۔ہم جیسے ادھیڑ عمر لوگ انھیں دیکھ کر ماحول کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

ٹرمینل 21 بنکاک کا ایک مصروف تجارتی اور تفریحی مرکز ہے۔یہاں اس وقت بلاشبہ ہزاروں لوگ کلبوں، ریستورانوں اور شاپنگ سنٹروں میں موجود تھے۔ جہاں ہم بیٹھے تھے وہاں سے نہ صرف باہر کا نظارہ صاف نظر آتا تھا بلکہ اس فلور پر گھومتے پھرتے دیگر لوگ بھی ہماری نظروں کے دائرے میں تھے۔ ان میں غیر ملکی سیاحوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ لیکن مقامی لڑکے لڑکیاں بھی ٹولیوں کی شکل میں ہنستے، اٹھکیلیاں کرتے، قہقہے لگاتے گزر رہے تھے۔یوں لگتا تھا کہ اس وقت یہاں خوشیوں کا راج ہے۔ کوئی دل اداس اور پشیمان نہیں ہے۔ ان فضاؤں اور ہواؤں میں صرف خوشیاں رقص کرتی ہیں۔مسکراہٹیں بجلیاں گراتی ہیں۔قہقہے ترنم جگاتے ہیں اور ہوائیں گیت گاتی ہیں۔

یوں تو بنکاک میں اونچی عمارتوں کا کوئی شمار نہیں ہے۔ تاہم تھوڑے فاصلے پر ایک عمارت جیسے آسمان سے بات کرتی

نظر آتی تھی۔ میں نے عملے کی ایک لڑکی سے اس عمارت کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے مسکراتے ہوئے بتایا ''یہ تھائی لینڈ کی سب سے بلند عمارت بیورے ٹاور (Baiyore Tower) ہے۔اس کی اونچائی 304 میٹر ہے۔ یہ عمارت دنیا کی بلند ترین عمارتوں میں دسویں نمبر پر ہے۔''

ہمارے ساتھ والی میز پر ایک ادھیڑ عمر مرد، اسی عمر کی ایک خاتون اور ایک نوجوان لڑکی بیٹھے تھے۔ مرد مقامی نظر آتا تھا جبکہ خاتون یورپین لگتی تھی۔ لڑکی میں ان دونوں کا امتزاج دکھائی دیتا تھا۔ اپنے رکھ رکھاؤ اور اندازِ تکلم سے ان کا تعلق طبقہ اشرافیہ سے نظر آتا تھا۔ جب میں اس عمارت کے بارے میں دریافت کر رہا تھا تو وہ شخص ہماری باتیں سن رہا تھا۔ ویٹر کے جانے کے بعد اس نے ہمیں مخاطب کیا ''اگر آپ بُرا نہ مانیں تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟''

اس وقت تک ہم دونوں فریق کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ صاحب سماجی ملنساری کے جذبے کے تحت گفتگو کے خواہاں ہیں۔ حالانکہ بڑے شہروں میں تعارف کا یہ انداز کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ تاہم کچھ لوگ بہت بے تکلف ہوتے ہیں اور بہت جلد دوسروں سے گھل مل جاتے ہیں۔ یہ صاحب بھی انہی میں سے لگتے تھے۔ ان کے سوال کے جواب میں میں نے انھیں بتایا ''ہم سڈنی، آسٹریلیا سے آئے ہیں۔''

یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے'' آپ کے طرزِ تکلم سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ آپ آسٹریلیا سے آئے ہیں۔ ویسے میں آسٹریلیا میں رہتا رہا ہوں''

میں نے کہا'' یہ جان کر بہت مسرت ہوئی کہ آپ آسٹریلیا میں رہ کر آئے ہیں۔ ویسے آپ کا قیام کس شہر میں تھا؟''

وہ صاحب کہنے لگے'' آپ نے اگر کھانا کھا لیا ہے تو ہماری میز پر کیوں نہیں آ جاتے؟''

میں نے بیگم کی طرف دیکھا اور پھر اُٹھ کر ان کی میز پر جا بیٹھے۔ ان صاحب نے تعارف کرواتے ہوئے بتایا'' مجھے پروفیسر جونز کہتے ہیں۔ یہ میری بیوی اینا اور میری بیٹی اینجلا ہے۔ ویسے یہ ہمارے انگریزی نام ہیں۔ ہمارے تھائی نام مختلف اور قدرے مشکل ہیں۔ جنھیں سمجھنا اور سمجھانا بھی مشکل ہے۔ ہم لوگ تھائی لینڈ کے ایک شہر شینگ مائی سے بنکاک کی سیر کے لیے آئے ہیں۔ میں یونیورسٹی میں پڑھاتا ہوں اور میری بیوی اینا ایک نجی ادارے میں ملازم ہے۔ جبکہ اینجلا یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ میں نے اسّی کی دہائی میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلز سڈنی سے معاشیات میں ماسٹر کیا تھا۔ اس دوران سڈنی میں رہنے اور بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ مجھے آسٹریلیا کی آب و ہوا، موسم اور وہاں کے لوگ بہت پسند ہیں۔ لیکن میں شینگ مائی اور تھائی لینڈ سے عشق کرتا ہوں۔ اس لیے کہیں اور نہیں رہ سکتا۔ تاہم آسٹریلیا بھی میرا پسندیدہ ملک ہے۔''

میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا'' میرا نام طارق مرزا ہے۔ میں ادیب اور صحافی ہوں۔ ہم بنیادی طور پر پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں مگر طویل عرصے سے مع فیملی آسٹریلیا میں رہتے ہیں''

پروفیسر جونز نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا'' مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یا تو آپ صحافی ہیں یا پھر کسی تحقیقی مشن پر ہیں۔ ویسے آپ سے محتاط رہنا پڑے گا، کہیں ساری گفتگو ریکارڈ نہ کر

رہے ہوں"

میں نے بھی قہقہہ لگایا" ریکارڈنگ تو کب کی شروع ہے، بس یہ ریکارڈر آپ کو نظر نہیں آئے گا"

پروفیسر جونز فوراً میری بات سمجھ گئے، مسکراتے ہوئے بولے" یہ تو مزید خطرناک ہے، بہر حال دیکھتے ہیں"

تھائی لینڈ کی اہم اور دلچسپ باتیں

پروفیسر جونز بہت رواں انگریزی بولتے تھے اور ان کا اندازِ گفتگو انتہائی دلنشیں تھا۔ انھوں نے ہر ایک کی پسند کی کافی کا آرڈر دیا۔ گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا تو معلوم ہوا کہ بیگم جونز اور ان کی بیٹی بھی بہت ملنسار ہیں۔ تھوڑی دیر میں کافی آ گئی۔ ہم سب نے اپنی اپنی پسند کی کافی کے کپ سنبھالے اور گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھایا۔ شروع میں آسٹریلیا اور تھائی لینڈ کے طرزِ حیات میں جو فرق ہے اس کا ذکر ہوا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پروفیسر جونز سے پوچھا" مجھے اپنے ملک تھائی لینڈ کے بارے میں کچھ بتایئے۔ اس کی تاریخ، اس کا جغرافیہ، اس کی معاشرت، اس کی معیشت، مذہب اور دوسری اہم باتوں کے بارے میں بتایئے؟"

پروفیسر جونز نے کہا" آپ نے تو ایک سوال میں بہت کچھ پوچھ لیا۔ خواتین ہماری باتوں سے بور نہ ہو جائیں۔ میں چند دلچسپ اور تاریخی حقائق کا تذکرہ کروں گا۔ تھائی لینڈ مشرقی ایشیا کا واحد ملک ہے جو کبھی یورپ کی کالونی نہیں بنا۔ تھائی لفظ کا مطلب ہی آزاد ملک ہے۔ ہماری اپنی زبان، اپنی تاریخ، اپنی تہذیب، اپنا لباس اور اپنی منفرد خوراک ہے۔ تھائی فوڈ (کھانے) دنیا بھر میں مقبول ہے۔ بدھ ازم یہاں کا سب سے بڑا مذہب ہے۔ تقریباً نوے فیصد تھائی بدھ مت کے پیروکار ہیں۔ یوں تو بدھ ازم کے ماننے والے پوری دنیا میں موجود ہیں لیکن اس کے سب سے زیادہ اور سب سے اہم مندر تھائی لینڈ میں ہیں۔ دنیا بھر کے ملکوں میں سب سے زیادہ سیاح تھائی لینڈ میں آتے ہیں۔ تھائی باشندوں کی روایتی مہمان نوازی کے علاوہ ہمارے شاندار مندر، شاہی محل اور تاریخی عمارتیں ان کی دلچسپی کا باعث ہیں۔ صرف بنکاک کے واٹ پاؤ مندر میں سالانہ کروڑوں سیاح آتے ہیں۔ تھائی لینڈ کا قومی پھول آرکیڈ ہے۔ جس کی ہزاروں قسمیں ہیں۔ تھائی لینڈ دنیا کا واحد ملک ہے جہاں ہاتھیوں پر بیٹھ کر پولو کھیلا جاتا ہے۔ تھائی لینڈ آبادی کے لحاظ سے دُنیا کا بیسواں بڑا ملک ہے۔ 1939 تک اس کا نام سیام تھا۔ تھائی لوگ اپنے بادشاہ یا ملکہ سے بہت محبت کرتے ہیں اور ان کی بے پناہ عزت کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص بادشاہ یا ملکہ کی توہین کرے تو اس کی سخت سزا ہے۔ کیونکہ اسے تھائی عوام کے جذبات کی توہین تصور کیا جاتا ہے۔

تھائی لینڈ کے Lapburi صوبے میں ایک Praprang مندر میں روزانہ چھ سو بندروں کو پرتکلف کھانا کھلایا جاتا ہے۔ جس میں بھنے ہوئے کباب، تازہ رسیلے پھل، خشک میوہ جات، آئس کریم اور دوسری لذیذ اشیا بندروں کو جی بھر کر کھلائی جاتی ہیں۔ یہ مقامی افراد کا بندروں سے اظہارِ تشکر کا ایک طریقہ ہے۔ وہ یہ شکریہ اس لیے ادا کرتے ہیں کہ ان بندروں کی وجہ سے ان کے رزق میں فراوانی ہے۔ اور ان کی وجہ سے انھیں ہزاروں نعمتیں حاصل ہیں۔ ان بندروں اور ان کی ضیافت کو دیکھنے کے لیے ہزاروں لاکھوں سیاح اس مندر میں جاتے ہیں۔ جو مقامی لوگوں کے روزگار کا ذریعہ بنتے ہیں۔ یوں وہاں انسان بندروں کے اور بندر

انسانوں کے کام آرہے ہیں۔

تھائی لینڈ میں ایک پل بہت مشہور ہے جو تھائی لینڈ اور برما کے درمیان ریلوے لائن بچھانے کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس پل کو بنانے کے لیے اسّی ہزار سے ایک لاکھ تک لوگ لقمۂ اجل بنے تھے۔اس لحاظ سے یہ پل دنیا کا سب سے مہنگا اور جان لیوا پل ہے۔

بنکاک میں سال کے زیادہ حصے میں درجہ حرارت 40 سینٹی گریڈ سے زیادہ اور سردیوں میں 26 سنٹی گریڈ سے اوپر رہتا ہے۔گویا یہاں سردی بالکل نہیں پڑتی۔لوگوں کے پاس نہ تو گرم ملبوسات ہیں اور نہ گھروں میں ہیٹر ہیں۔یہاں پورا سال بغیر آستین کی شرٹ پہنی جاتی ہے۔تھائی لینڈ میں 1430 چھوٹے بڑے جزیرے ہیں۔ان میں سے چند ایک سیاحت کے لیے بہت مقبول ہیں۔مشہور ہالی ووڈ فلم ,,دی بیچ,, بھی یہیں فلمائی گئی تھی۔

تھائی لینڈ میں کیڑے مکوڑے بہت شوق سے کھائے جاتے ہیں۔اس شوق کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ صرف کمبوڈیا سے ہر سال آٹھ سو ٹن کیڑے درآمد کیے جاتے ہیں۔تھائی لینڈ میں جھینگروں کی بڑے پیمانے پر افزائش کی جاتی ہے۔ملک بھر میں بیس ہزار سے زائد جھینگروں کے رجسٹرڈ فارمز ہیں۔تھائی حکومت ہر سال صرف اس مد میں سالانہ تیس ملین یعنی تین کروڑ امریکی ڈالر کماتی ہے۔“

پروفیسر جونز نے تھائی لینڈ کی اہم اور دلچسپ معلومات کا سلسلہ سمیٹتے ہوئے کہا ”اگرچہ تھائی لینڈ میں کروڑوں سیاح آتے ہیں۔لیکن ہماری قوم نے اپنی شناخت،اپنی تہذیب و تمدن اور اپنی زبان کو اس بھیڑ اور گہما گہمی میں گم نہیں ہونے دیا ہے۔ہم دنیا بھر کے سیاحوں کو خوش آمدید کہتے ہیں اور ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں۔مگر اس کے ساتھ ساتھ اپنے رسوم و رواج،اپنی آزادی اور اپنے قانون کا علم بلند رکھتے ہیں۔اس لیے یہ سیاح ہمارے رسم و رواج کی یادیں سمیٹ کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ہماری تہذیب اور تاریخ کی خوشبو بھی ان کے ہمراہ جاتی ہے۔آج کا تھائی معاشرہ قدیم اور جدید تہذیب کا خوبصورت سنگم ہے۔ہم نے جدید ٹیکنالوجی اور معاشی ترقی کے ثمرات ملک کے کونے کونے تک ہر خاص و عام تک پہنچا دیئے ہیں۔ہم نے اپنا تہذیبی ورثہ، مذہبی روایات، تاریخی عمارات،شاہی محلات اور نایاب نوادرات کو آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کردیا ہے۔اس کے لیے ہمارا شاہی خاندان، ہمارا جمہوری نظام اور ہمارے عوام سبھی مبارک باد کے مستحق ہیں۔“

پروفیسر جونز نے مختصر وقت میں بہت اہم اور دلچسپ معلومات فراہم کی تھیں۔دورانِ گفتگو وہ ایک بردبار پروفیسر نظر آتے تھے۔جب خاموش ہوتے تو ان کے لبوں پر کھلنڈری سی مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ میں نے فراہمیِ معلومات اور کافی پلانے پر ان کا شکریہ ادا کیا۔رات گئے تک یہ محفل جمی رہی جس میں بیگم جونز اور ان کی بیٹی نے بھی بھرپور حصہ لیا۔ہم نے فون نمبرز کا تبادلہ کیا اور دوبارہ ملنے کے وعدے کے ساتھ وہاں سے رُخصت ہوئے۔

(سفرِ تھائی لینڈ کی یہ دلچسپ داستان طارق محمود مرزا کے سفرنامہ ’دُنیا رنگ رنگیلی‘ سے لی گئی ہے۔) ■

Tariq Mirza
171, Robertson Street
Guildford NSW - 2161(Australia)

مومن فہیم احمد عبدالباری

آثارِ قدیمہ کے میدان میں کیریئر

ایک آرکیالوجسٹ بننے کے لیے لازمی ہے کہ آپ لسانیات اور انسانی علوم مثلاً تاریخ، شہریت، جغرافیہ، تاریخ انسانی کا علم (انتھراپولوجی) اور علم ارضیات کا مطالعہ کریں۔

ہم ہندوستان کے کسی بھی علاقے میں جائیں، قدیم زمانے کی عمارتیں، غار، قلعے، باغات وغیرہ کے باقیات ہمیں ضرور ملتے ہیں۔ جنھیں ہم عموماً آثار قدیمہ کہتے ہیں۔ ہندوستان کے گوشے گوشے میں اس طرح کے باقیات اور آثار ملتے ہیں جو ہماری قدیم تہذیب کے گواہ ہیں اور ان کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے۔ عام طور پر ایک آرکیالوجسٹ سے مراد لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ایسا شخص جو کچھ اوزار، آلات یا مشینوں کی مدد سے زمین کو کھودتا ہے اور پرانی چیزوں کی تلاش میں رہتا ہے لیکن درحقیقت آرکیالوجی یا آثار قدیمہ کا علم اس سے کہیں زیادہ اہمیت اور توجہ کا حامل ہے۔ آرکیالوجی یا علم آثار قدیمہ کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ''یہ انسانی تہذیب کی جڑوں کو تلاش کرنے کا مطالعہ ہے جو گذشتہ تہذیب کی انسانی فن تعمیر اور فن تحریر کی تحقیق کے ذریعے کیا جاتا ہے۔''

آرکیالوجی کی کئی شاخیں ہیں اور ہندوستان میں آرکیالوجی کے جن شعبوں میں کریئر کے مواقع حاصل ہیں، ان میں سے چند اہم درج ذیل ہیں:

(1) تاریخی (Historical) آرکیالوجی : آرکیالوجی کی یہ شاخ زمانہ قدیم میں استعمال ہونے والے زیورات و دیگر گھریلو سامان جو روزمرہ استعمال ہوتے تھے، ان کی دریافت اور تجزیہ سے متعلق ہے۔ مثال کے طور پر روزمرہ کے گھریلو سامان، زیورات، موسیقی کے آلات، طبی ضرورتوں کے پیش نظر استعمال ہونے والے اوزار و آلات وغیرہ۔

(2) بحری (Maritime) آرکیالوجی: آرکیالوجی کے اس شعبے میں زمانہ قدیم میں سمندر کی تہہ میں ڈوب جانے والے شہروں اور تہذیبوں کی کھوج کرنا، یا کسی بڑے جہاز جو سمندری حادثہ میں ڈوب گیا ہو اس کی باقیات کی تلاش کرنا جیسے ایڈوینچر سے پُر کام شامل ہیں۔ مثال کے طور پر 2016 میں عراق میں کردستان میں ماہرینِ آثار قدیمہ نے کانسہ کے زمانے کے چار ہزار سال پرانے ایک شہر کو دریافت کیا جس پر

مزید تحقیق چل رہی ہے، 2014 میں یونان میں سمندر میں تقریباً چار ہزار پانچ سو سال قبل ڈوب جانے والے شہر کو دریافت کیا گیا جو قریبی 'ڈیلوس' جزیرہ کے قریب ہے۔ مشہور جہاز 'ٹائٹینک' کے باقیات کی تلاش بھی بحری آرکیالوجی کے زمرے میں آتا ہے۔

(3) شہری (Urban) آرکیالوجی: اس کا تعلق تاریخی اہمیت کے حامل شہروں کے نقشوں اور منصوبوں کے مطالعے اور تجزیے سے ہے تاکہ ان کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکے اور ان کی کھدائی کے دوران کون سے زیورات، برتن یا دیگر سامان کے ملنے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اس کی مشہور مثالیں موہن جودارو اور ہڑپا تہذیب کے باقیات، رہن سہن، ثقافت وغیرہ کی دریافت ہے۔ دور جدید کا معروف شہر اور برطانیہ کی راجدھانی لندن شہری آثار قدیمہ کی اہم مثال ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر سے شہر میں ماہرین آثار قدیمہ نے ساتھویں صدی عیسوی کے کئی باقیات دریافت کیے ہیں۔

(4) خطاطی/کتبہ/نوشتہ (Epigraphy) آرکیالوجی: آثار قدیمہ کی اس شاخ کا تعلق پرانے زمانے کے دستاویزات، پتھروں اور دھاتوں پر لکھی ہوئی تحریروں کے مطالعہ اور ان کے تجزیے سے ہے۔ ان تحریروں سے ماہرین اس زمانے کے مصنفین، ان کی تہذیب وثقافت اور تاریخی اہمیت کا اندازہ لگاتے ہیں۔

(5) میوزیم آرکیالوجی: اس کا تعلق عجائب گھر (میوزیم) کی دیکھ ریکھ، ان میں موجود اشیاء اور قدیم نوادرات کی حفاظت اور ان کی از سر نو بحالی کی کوششوں وغیرہ سے ہے۔ آرکیالوجی کا یہ شعبہ زمانہ قدیم کے نوادرات کے اظہار

اور ان کی حفاظت کے ذریعے بنی نوع انسانی کے وجود کی با معنی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جس کے ذریعے کوئی سماج اپنی بنیادوں یا تاریخ کو سمجھنے کے قابل ہوتا ہے۔

ایک آرکیالوجسٹ کو کن چیزوں کا مطالعہ کرنا چاہیے

اگر آپ شعبہ آثار قدیمہ میں اپنا کریئر بنانا چاہتے ہیں تو آپ کو گیارہویں جماعت سے لسانیات یا انسانی علوم کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ تاریخ، انسانی علوم (انتھروپولوجی) سماجیات، جغرافیہ جیسے مضامین کا انتخاب کرنا ہوگا۔ آرکیالوجی میں گریجویشن، پوسٹ گریجویشن اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے پر آپ کو بحیثیت آرکیالوجسٹ کام کرنے کے مواقع مل سکتے ہیں۔ پی ایچ ڈی حامل افراد آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا میں تحقیق اور اکیڈمکس میں کریئر بنا سکتے ہیں جہاں تنخواہیں اور مواقع بہتر ہوتے ہیں۔ ایسے افراد جنھوں نے انسانی علوم میں گریجویشن نہیں کیا، وہ بھی اس مضمون میں اسپیشلائزیشن کر کے اپنا کریئر بنا سکتے ہیں۔ ایک آرکیالوجسٹ کو اپنی تاریخ اور ورثے میں زبردست دلچسپی ہونی چاہیے۔ اسے اپنی تہذیبی جڑوں کی تلاش اور مزید دریافت کرنے کی پیاس اور لگن ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ ایک تجزیاتی دماغ، تحقیق کا رجحان، چھوٹی

چھوٹی تفصیلات پر توجہ، اور صبر کا مادہ وغیرہ وہ صلاحیتیں اور خصوصیات ہیں جو ایک آرکیالوجسٹ میں ہونا لازمی ہیں۔

آرکیالوجی کی تعلیم دینے والے ادارے !

بھارت میں ایک آرکیالوجسٹ کے طور پر کام کرنے کے لیے بیچلرس اور ماسٹرس ان آرکیالوجی کی ڈگری ہونا لازمی ہے۔ جبکہ یونیورسٹی اور کالج میں پروفیسر یا اکیڈمیشین بننے کے لیے پی ایچ ڈی کرنا ضروری ہے۔ بھارت میں آرکیالوجی، تاریخ، میوزیولوجی اور ہیریٹیج مینجمنٹ وغیرہ کے کورسیس کی تعلیم دینے والے ادارے اور یونیورسٹیاں درج ذیل ہیں: بنارس ہندو یونیورسٹی (وارانسی)، برکت اللہ وشو ودھالیہ (بھوپال)، مہاتما گاندھی یونیورسٹی (کوٹیم)، مہاراج سیاجی راؤ یونیورسٹی (برودا)، دہلی انسٹی ٹیوٹ آف ہیریٹیج ریسرچ اینڈ مینجمنٹ (دہلی)، یونیورسٹی آف کیرالا، بنگلور یونیورسٹی، انسٹی ٹیوٹ آف آرکیالوجی (دہلی) وغیرہ۔

بھارت میں کریئر کے مواقع

بھارت عمدہ منصوبہ بندی کے قدیم شہروں کے ساتھ ساتھ تاریخی یادگاروں کا بھی مرکز ہے۔ یہاں قدیم تہذیبیں ہیں جن میں مغل، موریاس، سلطان اور نواب وغیرہ دور کی باقیات ہمیں ملتی ہیں۔ ملک میں موجود تمام آثار قدیمہ کی سرگرمیوں، ان تاریخی یادگاروں کی حفاظت اور بحالی کے لیے آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا (اے ایس آئی) ذمہ دار ہے۔ اے ایس آئی کی مختلف شاخیں ہیں جن میں کھدائی، پریشر، پانی کے اندر آثار قدیمہ، عجائب گھر، مندر سروے وغیرہ شامل ہیں اور اس کے کاموں کے لیے تربیت یافتہ ماہر آثار قدیمہ، قدیم کتبوں کے ماہرین، قدیم اشیا کے تجزیہ نگار اور سائنسدانوں کو بڑی تعداد میں ملازمت دیتے ہیں۔ دیگر تنظیموں جیسے نیشنل کونسل برائے تاریخی تحقیق، نیشنل میوزیم، نجی اور پبلک میوزیم، اور یونیورسٹیوں میں آثار قدیمہ کے ماہرین کے لیے ملازمت کے مواقع دستیاب ہیں۔ ایلک آرکیالوجسٹ کے طور پر آرکیالوجی میں ماسٹر ڈگری یافتہ افراد ڈپٹی سپرٹینڈنٹ آرکیالوجسٹ کے طور پر اے ایس آئی میں ملازمت حاصل کر سکتے ہیں لیکن اس کے لیے انھیں یو پی ایس سی کے ذریعے منعقدہ امتحان کامیاب کرنا لازمی ہے۔ اس کے علاوہ درس و تدریس کے شعبہ میں ماسٹرس کے ساتھ نیٹ امتحان کامیاب امیدوار ڈگری کالج اور یونیورسٹیز میں بحیثیت پروفیسر ملازمت حاصل کر سکتے ہیں۔ عوامی، نجی میوزیم میں بحیثیت میوزیم نگہداشت ملازمت حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ قومی و بین الاقوامی اہمیت کے حامل آرکیالوجی کے پروجیکٹس پر کام کر سکتے ہیں۔ ان پروجیکٹس کو بین الاقوامی تنظیمیں مالی امداد فراہم کرتی ہیں جن کا مقصد پرانے نوادرات کا مطالعہ و تجزیہ کرنا، پرانی دستاویزات کی تحریری تحقیق کرنا، کھنڈرات اور آثار قدیمہ کی جگہوں پر کھدائی کے ذریعے پرانے باقیات کی دریافت کرنا وغیرہ شامل ہیں۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ اور آثار قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ جو اپنی تہذیب و ثقافت کی حفاظت اور اس کی ترویج کے جذبے سے معمور ہوں انھیں انفرادیت کے حامل ان شعبوں میں دلجمعی اور محنت کے ساتھ آگے آنا چاہیے۔ ■

Momin Fahim Ahmed A.B
441, New Gauri Pada
Near Sahil Hotel
Bhiwandi - 421302, Thane (Maharashtra)

نصر ملک

بگ بین کے اسرار

یورپی ملکوں میں ایک دوسرے کے بارے میں مختلف کہانیاں مدتوں سے سینہ بسینہ چلی آرہی ہیں۔ یہاں برطانیہ کے متعلق فن لینڈ میں مشہورایسی ہی ایک لوک کہانی پیش کی جارہی ہے۔ (نصر ملک)

یہ ایک بہت ہی خاموش دن تھا اور ملکہ ایلزبیتھ الثانی نے سوچا کہ کیوں نا آج محل کو دیکھا جائے۔ اسے اپنی دادی کی ایک فوٹو بہت ہی پسند تھی، سواس نے ابتدا اِسی فوٹو سے کی۔ وہ اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور کچھ وقت تو چپ چاپ، اس پر نظریں جمائے کھڑی اسے دیکھتی رہی اور پھر اچانک اس نے آگے بڑھ کر اِسے دیوار سے اتارنا چاہا، اسے تو میرے کمرے میں ہونا چاہیے اس نے سوچا، لیکن جونہی اس نے تصویر کو اتارنے کے لیے ہاتھ اونچا کیا تو اسے اس کے پیچھے ایک چھوٹا سا خفیہ دروازہ دکھائی دیا۔ ملکہ نے بن سوچ سمجھے، بڑی احتیاط سے اسے کھولا تو اسے وہاں ایک نقشہ ملا جس میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ اس کی عظیم دادی کے سب سے قیمتی مال و اسباب کا خزانہ کہاں ہے۔ لیکن بد قسمتی سے یہ نقشہ بہت پرانا تھا اور اسے یہ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ یہ خزانہ ہے کہاں۔ وہ ٹاور آف لندن کو جانا چاہتی تھی۔ وہ برمنگھم پیلس سے ہوتی ہوئی، ہائیڈ پارک، پارلیمنٹ ہاؤس، ویسٹ منسٹر ایبے اور پکاڈلی سرکس سے ہوتی ہوئی دریائے ٹیمز کے کنارے ٹاور آف لندن تک گئی۔

موسم بہت خوفناک تھا۔ مسلسل بارش اور ہوائیں اور پچھلی چند راتوں سے تو دھند اس قدر تھی کہ سامنے کھڑے کسی فرد کو پہچاننا بھی مشکل تھا۔

ملکہ کے ساتھ ایک لارڈ بھی تھا، جو اس کا بڑا قابلِ اعتماد دوست تھا۔ اور جو لندن کی گلیوں اور سڑکوں کو اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح جانتا تھا۔ اب وہ دونوں خزانے کی تلاش میں تھے۔

وہ چلتے چلتے ٹاور آف لندن تک جا پہنچے اور پھر وہ اس کی گراؤنڈ فلور پر گئے لیکن وہاں چوہوں کے بلوں اور کچھ مردہ چوہوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

ٹاور آف لندن ایک جیل نما، دفاعی قلعہ تھا جس کے اندر تاج شاہی تھا جس کی حفاظت کے لیے سخت گہرے ڈنک مارنے والی شہد کی مکھیوں کے چھجے تھے۔ یہاں دوسری جگہوں پر بھی انھیں کچھ نہ ملا۔

اب وہ پارلیمنٹ میں جا پہنچے اور وزیر اعظم سے پوچھا تو اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا، یہاں ابھی حال ہی میں ہم نے کچھ کام وغیرہ کرایا ہے اور ہمیں یہاں ایسی کوئی بیش قیمت شے نہیں ملی۔

انھوں نے لندن کی سبھی عمارتوں کو چھان مارا لیکن کچھ بھی ان کے ہاتھ نہ آیا۔

پھر کسی نے انھیں اشارہ دیا: پورٹو بیلو روڈ پر واقع انٹیک قدیم (اشیا کی مشہور دکان پر جائیں، وہاں ایک بہت ہی قدیم نقشہ ہے جو مدت ہوئی کسی کو ملا تھا، شاید وہ تمھاری کچھ مدد کر سکے۔

ناامیدی میں مبتلا وہ دونوں گلی کے کونے پر پڑے ایک

بڑے پتھر پر بیٹھ گئے۔ وہ خزانے کو پانے کے لیے بے تاب تھے لیکن ابھی تک سوائے مایوسی کے انھیں کچھ نہیں ملا تھا۔ ملکہ گم سم، اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

یہ شہر بڑا منفرد ہے۔ موٹر کاریں بائیں جانب چلتی ہیں۔ اسٹیرنگ وہیل دائیں جانب ہیں۔ ڈبل ڈیکر بسیں، فاسٹ فوڈ کے ریسٹورنٹ، فش اینڈ چپس۔ سینڈوچ و سوپ، ہمارا کھانے کا انداز بالکل مختلف ہے..... ہاں ہم گرینوچ میریدیان سے کیا توقع رکھ سکتے ہیں !وہ سوچ رہی تھی۔

اچانک بارش شروع ہو گئی۔ اوہ! پھر وہی لندن کے معمول کی بارش۔ وہ زیرلب بولی۔

پھر جیسے کوئی معجزہ ہوا۔ بارش کے پانی نے دھند کو صاف کر دیا تھا اور انھیں دکھائی دیا کہ وہ عمارت جہاں وہ ابھی تک نہیں گئے وہ Big Ben تھی۔

یہی تو ایک جگہ ہے جہاں میں خزانے کی تلاش میں ابھی تک نہیں گئی۔ ملکہ بولی لیکن یہ کیا؟ کلاک تو رکا ہوا ہے!

وہ بھاگم بھاگ وہاں پہنچے اور اندر جا کر دیکھا کہ کلاک کا ایک پرزہ کوئی لے اڑا تھا اور پورا شہر مفلوج ہو گیا تھا۔ انھیں وہاں ڈاکو کے پیروں کے نشان ملے اور انھوں نے اس کا پیچھا کرنا شروع کر دیا..... وہ چلتے چلتے برٹش میوزیم جا پہنچے، جہاں ایک لڑکے نے انھیں بتایا کہ ایک چور کلاک کے گھنٹے کی آواز سے سخت بیزار تھا کیونکہ وہ اسے ویک اینڈ میں صبح سویرے نیند سے جگا دیتی تھی۔ اور اب کلاک کا گھنٹہ کبھی نہیں بجے گا اور جو پرزہ چور لے آیا ہے، اب کبھی واپس نہیں کرے گا۔

ملکہ نے لڑکے سے چور کا اتا پتا معلوم کیا اور وہ دونوں اس چور کے پاس پہنچ گئے۔ ملکہ نے اس کو بتایا کہ لندن والوں کے لیے یہ کلاک اور اِس کے گھنٹے کی آواز کتنی اہمت رکھتی ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ یہ کلاک تو پوری دنیا میں لندن ہی کے نہیں پورے برطانیہ کے شہری تشخص (شناخت، پہچان) کی ایک علامت و مثال ہے۔ ملکہ نے وعدہ کیا کہ وہ اسے لندن ہی میں ایک ایسی شاندار اور بہت ہی آرام دہ جگہ دے گی جہاں وہ ویک اینڈ بڑے سکون سے گزار سکے گا اور گھڑیال کی آواز اسے نہیں جگائے گی۔

میرے لیے تو سب سے بہتر جگہ لندن کے شاہی بوٹینیک باغات ہیں، چور نے کہا۔

چور نے ملکہ کو چرایا ہوا پرزہ واپس کر دیا اور ملکہ نے حکم دیا کہ Big Ben کی فوراً مرمت کی جائے۔

اب ملکہ اور اس کا لارڈ دوست جب کلاک کو دیکھنے کے لیے ٹاور کے اوپر جانے والی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے تو انھوں نے وہاں دیوار میں چھپائی گئی ہوئی ایک میلی کچیلی، پھٹی پرانی واسکٹ دیکھی۔ ملکہ نے اسے کھولا تو اس کی ایک جیب کے اندر ایک قدیم کاغذ پر خزانے کے مقام کی تفصیل لکھی ہوئی تھی۔ ملکہ نے اسے تہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا، چلو، واپس چلیں، میں تھک گئی ہوں اور اب ٹاور پر اوپر نہیں جا سکتی۔ اس نے اپنے دوست لارڈ سے کہا۔ خزانہ بکنگھم پیلس کے اندر ہی دفن تھا۔

اب ملکہ اور اس کا خاندان اور شاہی محل کے سبھی لوگ ہمیشہ کے لیے امیر ترین اور خوش باش زندگی بسر کرنے لگے تھے۔

■

Mohd Nasarullah Khan Malik
(Nasar Malik)
Vaerebrovej # 14/1-3
2880 Bagsvaerd, Copenhagen,Denmark
Ph : 0045 22166554

اسما انصاری

فاسٹ فوڈ

فاسٹ فوڈ یعنی وہ غذا جو کم وقت میں تیار ہو۔ اس اصطلاح کا اندراج پہلی بار انگریزی لغت میں ہوا۔ حالانکہ فاسٹ فوڈ کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اس کا آغاز اٹھارویں صدی میں امریکہ سے ہوا۔ ابتدا میں سستے اور غیر معیاری قسم کے برگر صرف میلوں ٹھیلوں اور سرکس وغیرہ میں اسٹالز پر دستیاب ہوتے تھے۔ بعد ازاں انیسویں صدی میں 'وائٹ کاسل White Castle' نامی پہلا فوڈ چین وجود میں آیا جو اعلیٰ معیار کے برگر اپنے گراہکوں کو ریستورانوں میں فراہم کرتا تھا۔ اس کے بعد میکڈونلڈ برادرز Mcdonald's نے 1940 اور KFC Kentucky Fried Chicken نے 1952 میں کام کرنا شروع کیا اور یوں دیکھتے ہی دیکھتے تیزی سے بدلتی دنیا میں فاسٹ فوڈ کا رجحان بھی تیزی سے فروغ پانے لگا۔

فاسٹ فوڈ میں پزا، برگر، چپس، سینڈوچ، نوڈلس، فرائیڈ رائس، شاورما، ہیم برگر، فرنچ فرائیز، سموسے، وڑا پاؤ، پیسٹری وغیرہ شامل ہیں۔ ان غذاؤں میں کاربوہائیڈریٹ، چکنائی، شکر، نمک، مختلف قسم کے مسالے اور کیمیائی ماڈے زیادہ مقدار میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ انھیں دلکش بنانے کے لیے مصنوعی رنگ اور خوشبو کا بھی استعمال ہوتا ہے۔ مسالوں کا استعمال فاسٹ فوڈ کو زیادہ لذیذ اور چٹپٹا بنا دیتا ہے۔ اس لیے یہ لوگوں کی پہلی پسند بن گئے۔ بالخصوص نوجوان طبقہ اور بچے اسے بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ فاسٹ فوڈ نہ صرف اس دور کے نوجوانوں میں ایک خاص رجحان بن کر ابھرا بلکہ اس سے ان لوگوں کو بھی بھرپور فائدہ ہوا جنھیں کام کے دوران گھر کا کھانا دستیاب نہ تھا اور وہ اپنے مختصر دورانیے کے بریک ٹائم میں صاف ستھرا اور صحت بخش کھانا کھانے کے خواہش مند تھے۔

رفتہ رفتہ فاسٹ فوڈ کی مقبولیت یورپ اور امریکہ کے ساتھ ساتھ دنیا میں پھیلنے لگی اور اس دوران غیر ملکی مشہور فوڈ چینز نے بھی اپنا نیٹ ورک بڑھایا اور دنیا بھر کے ممالک میں فاسٹ فوڈ کلچر تیزی سے فروغ پانے لگا۔ مغرب سے فاسٹ فوڈ کلچر مشرق اور دنیا کے دوسرے خطوں میں بھی پہنچ گیا۔ طبی

ماہرین اور صحت سے متعلق اداروں نے فاسٹ فوڈ کو نقصاندہ قرار دیا ہے مگر زمانے کی تیز رفتار ترقی اور وقت کی کمی کے باعث یہ کلچر تیزی سے ساری دنیا میں پھیل رہا ہے۔

کبھی کبھی وقت کی کمی کے پیش نظر فاسٹ فوڈ کے استعمال میں ہرج نہیں لیکن انسان اس کا عادی ہوجائے تو یہ صحت کو بری طرح متاثر کرتا ہے۔ ہر کام کے اصول ہوتے ہیں، لہٰذا کھانا کھانے کے بعد بھی چند اصول ہیں۔ کھانا اطمینان وسکون سے کھایا جائے۔ ہر نوالے کو زیادہ سے زیادہ چبایا جائے تاکہ غذا باریک ہوجائے اور اس میں لعاب دہن مناسب مقدار میں شامل ہو۔ اس سے غذا آسانی سے ہضم ہوجاتی ہے۔ فاسٹ فوڈ کھاتے وقت عموماً ان باتوں کا خیال نہیں رکھا جاتا۔لوگ وقت کی کمی کے باعث تیزی سے کھاتے ہیں اور یہ عمل ہاضمے پر اثر ڈالتا ہے۔ چونکہ فاسٹ فوڈ جسم میں جانے کے بعد جلدی ہضم نہیں ہوتا، نتیجتاً اس میں استعمال ہونے والے مسالے معدے میں تیزابیت پیدا کرتے ہیں جو آگے چل کر السر (آنتوں کے چھالے، آنتوں کی سوزش) کا سبب بنتے ہیں۔

برطانیہ کنگ کالج لندن کی تحقیق کے مطابق معدے میں پائے جانے والے ایسے بیکٹریا جو انسانی جسم کو آنتوں کی بیماریوں، ذیابیطس، امراض قلب اور کینسر وغیرہ جیسی مہلک بیماریوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔ فاسٹ فوڈ کے مسلسل استعمال سے وہ بیکٹریا ایک تہائی کی تعداد میں کسی حد تک معدے سے ختم ہوجاتے ہیں۔ اس کی وجہ سے انسانی جسم کو نئی خطرناک بیماریوں کا خطرہ لاحق ہوجاتا ہے اور ایسے بیکٹریا کی تعداد معدہ میں تقریباً ساڑھے تین ہزار تک ہوتی ہیں۔

فاسٹ فوڈ میں موجود چکنائی کی زیادہ مقدار جسم کو فربہ بناتی ہے اور خون میں کولیسٹرال کی مقدار میں اضافہ کرتی ہے۔ کولیسٹرال خون کی نالیوں کی اندرونی دیواروں میں جمتا رہتا ہے جس کی وجہ سے خون کی نالیوں کا قطر کم ہوتا جاتا ہے۔ نتیجے میں بلڈ پریشر میں اضافے اور دل کے امراض کا خدشہ بڑھ جاتا ہے۔

فاسٹ فوڈ کی تیاری کے دوران ایسے کیمیائی اجزا بھی

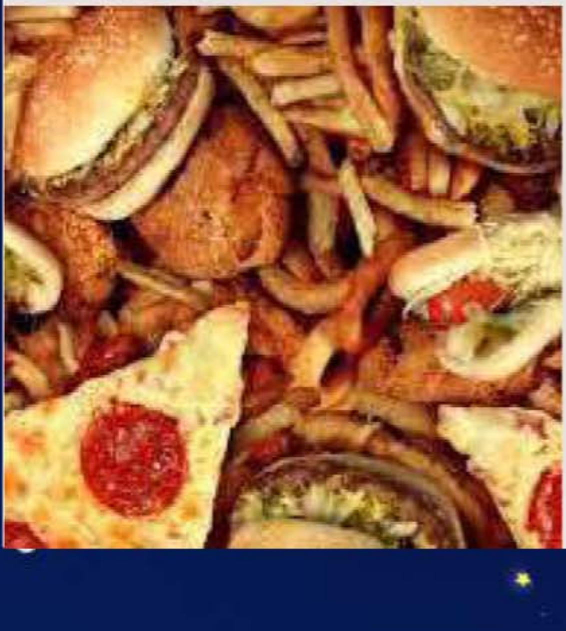

صحت و تندرستی

ان میں شامل کیے جاتے ہیں جو صحت کے لیے نہایت ہی مضر اور خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ ایک تحقیق کے مطابق فاسٹ فوڈ کا مسلسل استعمال کرنے والے افراد میں ڈپریشن کی شرح دوسرے افراد کی بہ نسبت 50 فی صد زیادہ ہوتی ہے اور اس میں موجود کیمیائی اجزا ہمارے دماغ کی بھوک لگنے کی حس کو متاثر کرتے ہیں۔ فاسٹ فوڈ میں کیلوریز کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے انسان کو فوری طور پر راحت محسوس ہوتی ہے مگر کیلوریز کی مقدار زیادہ ہونے کی وجہ سے جسم پھولنے لگتا ہے، انسان چاق و چوبند نہیں رہتا۔ وہ سستی اور کاہلی کا شکار ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے اس کی جسمانی کارکردگی بھی متاثر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ فاسٹ فوڈ انسان کے مدافعتی نظام کو کمزور کردیتا ہے اور یادداشت کو بھی کمزور کردیتا ہے، اس کے علاوہ ہارمونز میں تبدیلی کا سبب بھی بنتا ہے۔ ان غذاؤں میں شکر وافر مقدار میں پائی جاتی ہے جس سے انسان ذیابیطس میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

بچے چونکہ فاسٹ فوڈ کے عادی ہوتے جارہے ہیں، اس لیے ان میں اس کے خطرناک اثرات نظر آتے ہیں۔ اس سے بچوں میں موٹاپے کا تناسب بڑھتا جارہا ہے۔ فاسٹ فوڈ چھوٹے بچوں کے لیے بے حد نقصان دہ ہوتا ہے کیونکہ ان کا جسم اور دماغ دونوں نشو ونما کے مراحل سے گزر رہے ہوتے ہیں اور اس میں موجود نقصان دہ مادّے ان کی بڑھتی ہوئی ذہنی نشو ونما اور جسمانی صلاحیتوں کو روک دیتے ہیں اور ان کی صحت مندانہ نشو ونما ٹھیک طریقے سے نہیں ہوپاتی۔ ایسے بچے سست، کاہل اور چڑچڑے ہوجاتے ہیں۔ ان میں افسردگی اور بددلی پیدا ہوتی ہے۔ یہ بچوں کی دماغی کارکردگی کو متاثر کرتے ہیں۔

فاسٹ فوڈ کلچر ہماری صحت کے لیے ایک بڑا خطرہ ہے اور اس کے مضر اثرات سے بچنے اور صحت مند رہنے کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں میں اس کے نقصانات کو اجاگر کیا جائے اور صحت بخش سادہ اور روایتی کھانوں، خصوصاً گھر کے کھانوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ خاص طور پر چھوٹے بچوں کو فاسٹ فوڈ سے دور رکھنے کی اشد ضرورت ہے۔ بچوں کو فاسٹ فوڈ کے متبادل کے طور پر تازہ سبزیوں، پھلوں، دودھ اور مختلف غذائیت سے بھرپور اشیا کی عادت ڈلوانی چاہیے اور ہر انسان کو چاہیے کہ جہاں تک ہوسکے، فاسٹ فوڈ سے پرہیز کرے اور متوازن غذا کا استعمال کرے جس کے ذریعے ہمیں تمام غذائی اجزا مناسب مقدار میں حاصل ہوتے ہیں۔ متوازن غذا ہی ہماری بہترین صحت کی ضامن ہے۔ ■

Asma Ansari
House No: 16, Survey No 374,
Maolina Park, Near Masood Masjid
Firdos Nagar
Dhule- 424001 (Maharashtra)

آٹھویں قسط

اردو زبان کا جادو

پیارے دوستو! 'بچوں کی دنیا' آپ سب کا اپنا رسالہ ہے۔ ہماری کوشش رہتی ہے کہ رسالے میں زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور کارآمد تحریریں شائع کی جائیں۔ اِس رسالے کی اشاعت کا سب سے اہم مقصد یہ ہے کہ ہم اپنی زبان اردو کو فروغ دیں اور زیادہ سے زیادہ لوگ اس زبان کو سیکھیں۔ کسی بھی زبان کو سیکھنے کے لیے اگر اس میں کھیل اور مزے کو شامل کرلیا جائے تو سیکھنے میں دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ ہم نے اردو زبان کے لسانی کھیلوں پر مشتمل ایک سلسلہ شروع کیا ہے جو قومی اردو کونسل سے شائع کتاب 'اردو زبان کا جادو' سے لیا گیا ہے۔ امید ہے کہ آپ سب اس سلسلے کو پسند کریں گے۔ (ادارہ)

اِس ذہنی آزمائش کے جوابات اِسی شمارے میں آپ کو مل جائیں گے۔

(8) ساتھیوں کی سیڑھی

مقصد : ہم شکل حروف کی پہچان

ہدایت : سیڑھی پر چڑھتے ہوئے ہر خانے میں ہم شکل حرف لکھتے جایئے اور سیڑھی چڑھتے جایئے۔

کھلاڑی:1 وقت:3 منٹ نمبر: ہر حرف کے لیے 1

									ق
						ک		ع	
					س				
					ر				
					پ				
ع		د		ط					
ج									
ت									
ص									

دوسری قسط

انسانیت

مصنف: انیس اعظمی

مصور: فخرالدین

ISBN: 978-93-87510-53-1

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون ایف سی 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔ 110025

₹ 25/-

فادر : آپ سب لوگ اَمارا سات تھوڑا کوآپریٹ کرو۔ اِمارا ضلع کلکٹر ساب سے وائرلیس پر بات ہوا ابی اَبی۔ اُدر سے ایک ڈاکٹر، دو نرس لوگ، بہت سی دوائی لے کر جیپ میں اِدر آنے کو ریڈی ہو گیا ہے۔ اِس واسطے آپ لوگ اپنا اپنا بچّہ کو پلیز اِدر سے مت لے جاؤ۔

نینسی : (کراس بناتے ہوئے) گاڈ بلیس یو.......... تھینک یو فادر.......... تھینک یو ویری مچ

فادر : تھینک یو؟ کس بات کا واسطے تھینک یو بولا، سسٹر نینسی؟

نینسی : اِس بات پر فادر، اِدر میڈیکل ایڈ آتا۔

فادر : گاڈ بلیس یو سسٹر۔ مدراس رجمنٹ کا میڈیکل پیرا یونٹ اَمارا ہیلپ کا واسطے میں اَبی اِدر آتا۔

قبائلی 1 : ارے ڈاکگڈر کو آتے آتے شام ہو جائے گی، پکّی بات

قبائلی 2 : تب تک کئی بچّہ لوگ مر جائے گا.......... ہے بھگوان۔

قبائلی عورت : ارے میری بٹیا تو پہلے ہی اَدھ مری تھی، لگتا ہے اب یہ نہیں بچے گی۔

مارگریٹ : میں اُمید کرتی کہ میڈیکل ایڈ آدھا گھنٹہ میں اِدر آ سکتا۔

فادر : نئیں اِس سے بہت پہلے میڈیکل ٹیم اِدر آئے گا۔

نینسی : اِتنا جلدی کیسا آئے گا فادر؟

فادر : اَم ڈی ایم ساب کو بم پھٹنے کا جب نیوز دیا تو وہ بتایا اَم کو کہ امارے اسکول سے تین کلومیٹر کا فاصلہ پر ایک آرمی یونٹ کا کیمپ ہے۔ جنگل کے اندر اِس آرمی یونٹ کے ڈاکٹر لوگ کو وائرلیس پر فوراً اِدر آنے کا واسطے بول دیا ہے۔

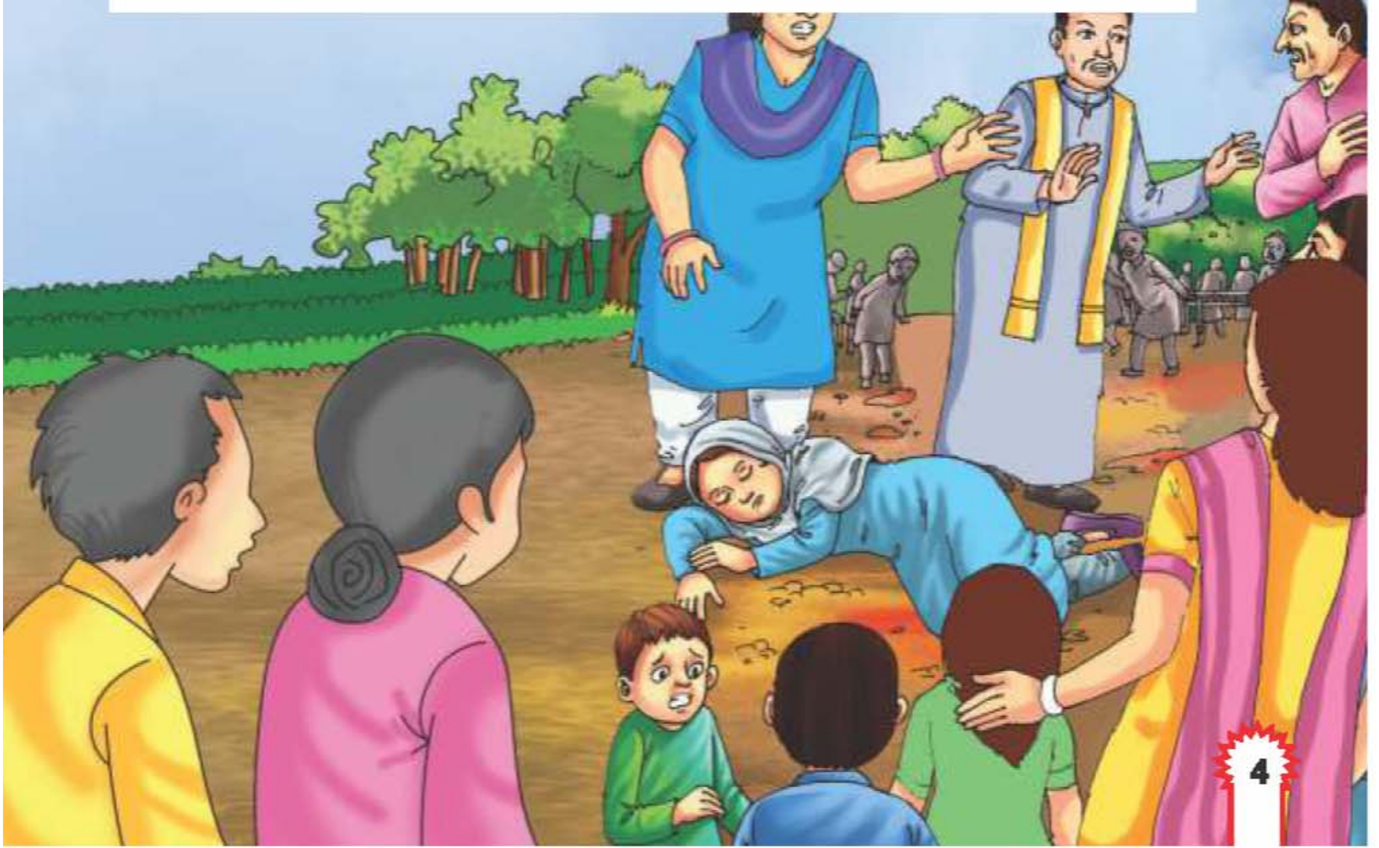

مارگریٹ : اس کا مطلب، فوجی میڈیکل ٹیم جلدی ہی اِدر آنا مانگتا۔

فادر : یَس۔ یہی بات تو اُم تم کو بولا، سسٹر۔

قبائلی عورت : یہ ماسٹرنی کا گٹر پٹر کر رہی ہے جی؟

قبائلی 1 : ہم تو یہی نہیں سمجھ رہے ہیں کہ ماسٹرنی اِدھر کی بھاسا بول رہی ہے کہ ولایتی بھاسا؟

قبائلی 2 : ان کی گٹر پٹر میں ہماری تو پٹر پٹر ہو رہی ہے، ہم کا کریں۔

(مارگریٹ خوش ہو کر کراس بناتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر چہرے کو آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے دعا کرتی ہے، اِسی لمحہ کچھ قبائلی چارپائی پر ایک بے ہوش بچّی کو لے کر آتے ہیں اور اسٹیج کے درمیانی حصّے میں رکھ دیتے ہیں۔)

قبائلی 1 : لگتا ہے بے چاری کو بہت چوٹ لگا ہے۔

قبائلی 2 : اِس بٹیا کو بھگوان ہی بچائیں تو بچائیں۔

قبائلی عورت : یہ ہے کس کی بٹیا، بولو تو؟

قبائلی 1 : چُپّے چاپ بیٹھی رہ، بڑا فوجی ڈانگڈر آنے والا ہے۔

(تبھی روتی پیٹتی ایک قبائلی عورت دو ایک لوگوں کے ساتھ چارپائی کے پاس آتی ہے اور بچّی کو دیکھ کر بین کرتے ہوئے رونے لگتی ہے، کچھ لوگ پکڑ کر اُسے بیٹھاتے ہوئے تسلّی دیتے ہیں۔)

قبائلی عورت : ارے جالموں نے میری بٹیا کو مار ڈالا............ارے کوئی ڈانگڈر بلاؤ۔

فادر : ڈاکٹر پہنچنے والے ہیں، سسٹر آپ شور مت کرو............بچّی اور ڈر جائے گا

قبائلی 1 : (عورت سے) پادری ساب بولے نا اِدھر دھیرے رونے کا............چُپّے چاپ بیٹھی رہو۔

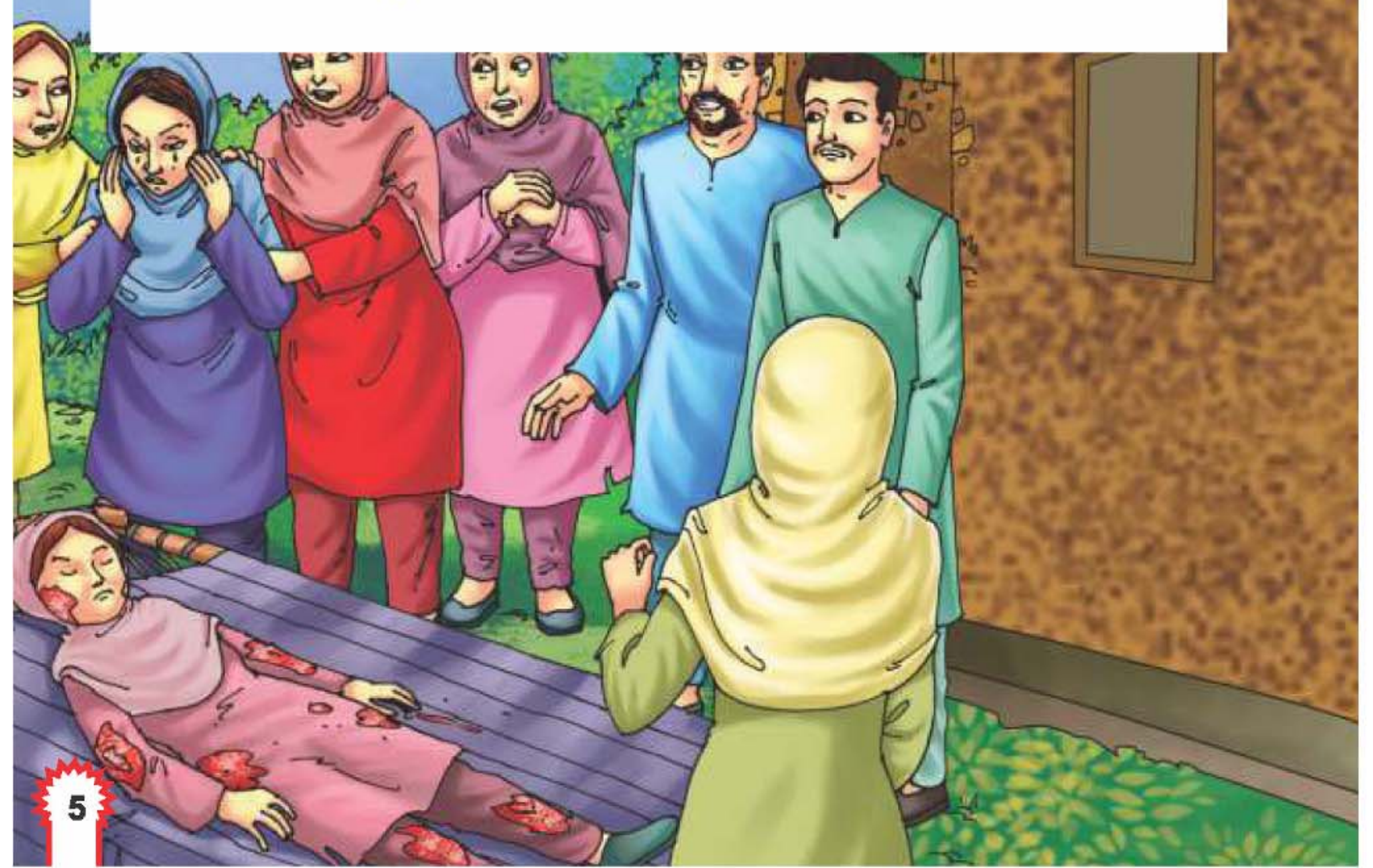

مارگریٹ : اس کا مطلب، فوجی میڈیکل ٹیم جلدی ہی اِدر آنا مانگتا۔

فادر : یَس۔ یہی بات تو اُم تم کو بولا، سسٹر۔

قبائلی عورت : یہ ماسٹرنی کا گٹر پٹر کر رہی ہے جی؟

قبائلی 1 : ہم تو یہی نہیں سمجھ رہے ہیں کہ ماسٹرنی اِدھر کی بھاسا بول رہی ہے کہ ولایتی بھاسا؟

قبائلی 2 : ان کی گٹر پٹر میں ہماری تو پٹر پٹر ہو رہی ہے، ہم کا کریں۔

(مارگریٹ خوش ہو کر کراس بناتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر چہرے کو آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے دعا کرتی ہے، اِسی لمحہ کچھ قبائلی چارپائی پر ایک بے ہوش بچّی کو لے کر آتے ہیں اور اسٹیج کے درمیانی حصّے میں رکھ دیتے ہیں۔)

قبائلی 1 : لگتا ہے بے چاری کو بہت چوٹ لگا ہے۔

قبائلی 2 : اِس بٹیا کو بھگوان ہی بچائیں تو بچائیں۔

قبائلی عورت : یہ ہے کس کی بٹیا، بولو تو؟

قبائلی 1 : چُپّے چاپ بیٹھی رہ، بڑا فوجی ڈانگڈر آنے والا ہے۔

(تبھی روتی پیٹتی ایک قبائلی عورت دو ایک لوگوں کے ساتھ چارپائی کے پاس آتی ہے اور بچّی کو دیکھ کر بین کرتے ہوئے رونے لگتی ہے، کچھ لوگ پکڑ کر اُسے بیٹھاتے ہوئے تسلّی دیتے ہیں۔)

قبائلی عورت : ارے جالموں نے میری بٹیا کو مار ڈالا........... ارے کوئی ڈانگڈر بلاؤ۔

فادر : ڈاکٹر پہنچنے والے ہیں، سسٹر آپ شور مت کرو........... بچّی اور ڈر جائے گا

قبائلی 1 : (عورت سے) پادری ساب بولے نا اِدھر دھیرے رونے کا........... چُپّے چاپ بیٹھی رہو۔

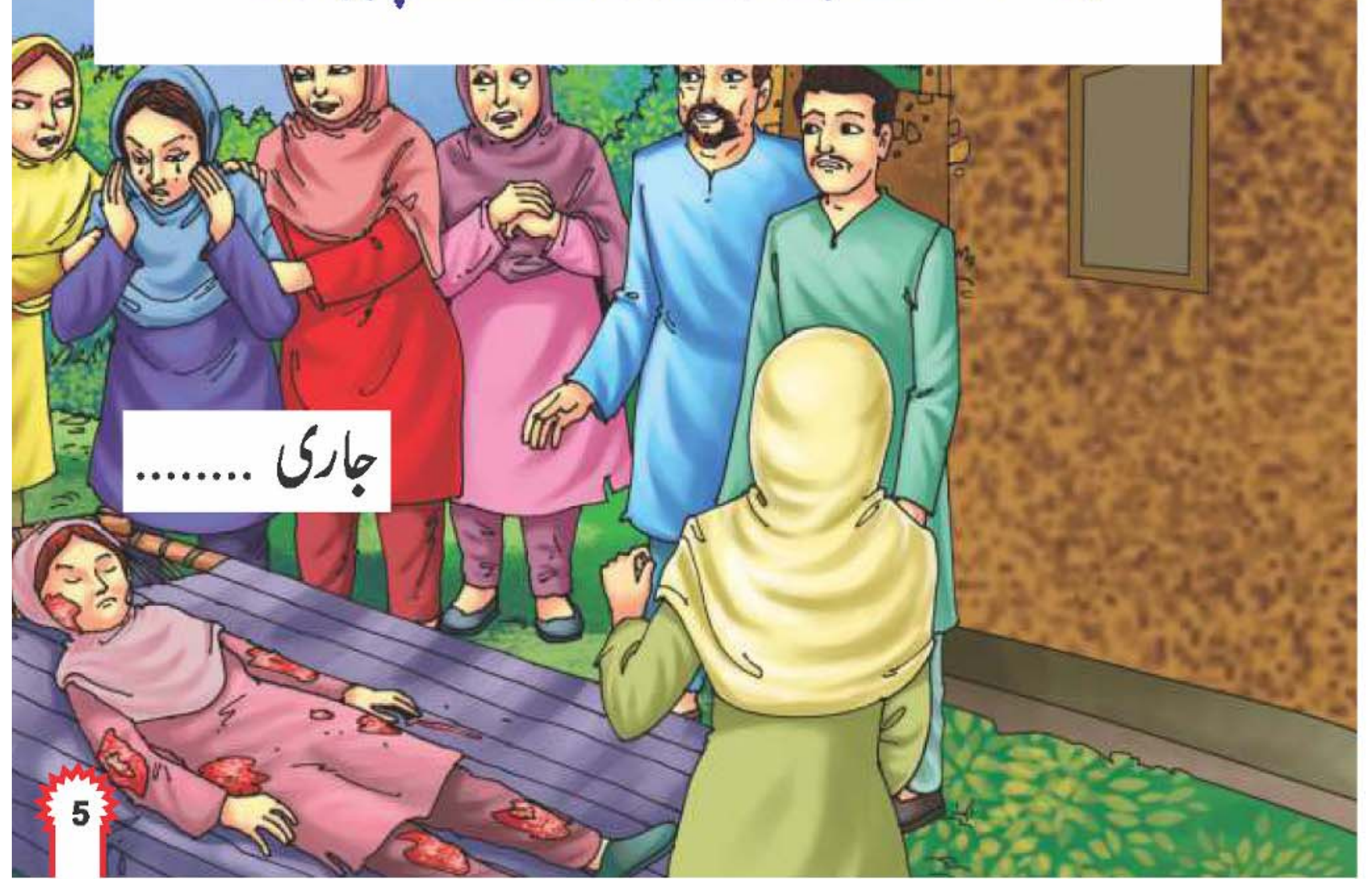

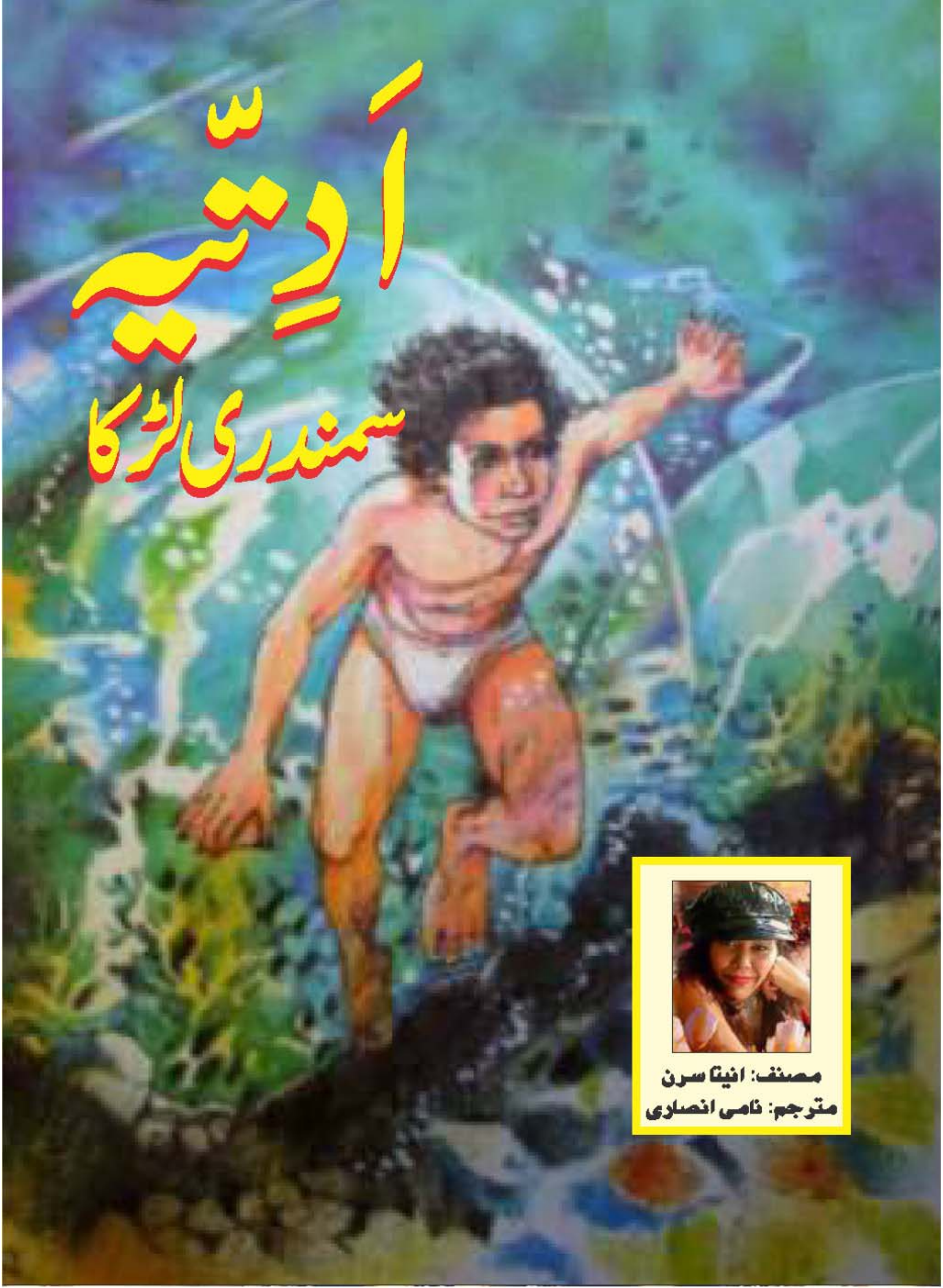

اَدِتّیہ

سمندری لڑکا

مصنف: انیتا سرن
مترجم: نامی انصاری

قسط وار ناول

آپ سب نے قصہ حاتم طائی، شہر میں جنگل، الٹا درخت اور بے زبان ساتھی جیسے سلسلوں کو بہت پسند کیا ہے۔ ہماری کوشش رہتی ہے کہ ہم ایسی تخلیقات پیش کریں جن میں آپ کے لیے نئی معلومات ہو اور آپ زندگی میں کچھ بہتر کرنے کی کوشش کریں۔ ہم نے انیتا سرن کی لکھی ایک نئی دلچسپ داستان Aditya- The Underwater Boy کا آغاز کیا ہے جس کا اردو ترجمہ نامی انصاری نے کیا ہے۔ اس میں آپ کو سمندر کی خوبصورت دنیا دیکھنے کو ملے گی اور نئی نئی جانکاری بھی حاصل ہوگی۔ 'بچوں کی دنیا' کے اس نئے سلسلے کو یقیناآپ سب پسند کریں گے۔ (ادارہ)

سمندری پہاڑی پر

پندرہ ڈولفن مچھلیاں ہر روز، 22 میل فی گھنٹے کی رفتار سے آگے بڑھتی رہیں۔ ادتیہ نے کی پر سواری کرلی تھی۔ وہ سب سے زیادہ سینئر ہونے کی وجہ سے سب کی لیڈر بھی تھی اور سب سے آگے چل رہی تھی۔ اس کے بھاری بھرکم جسم پر شارک اور دوسری بڑی مچھلیوں سے ٹکراؤ کے نشانات موجود تھے۔ ڈولفن مچھلیاں تھوڑی تھوڑی دیر میں سانس لینے کے لیے اپنے منہ پانی سے باہر کرلیتی تھیں اور اس وقت ان کی ناک سے زور کی آوازیں پیدا ہوتی تھیں۔ یہ ڈولفن مچھلیاں صرف پانی میں تیرتے ہوئے آگے نہیں بڑھ رہی تھیں بلکہ ایک دوسرے سے چہل بازی بھی کرتی جارہی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنا پیٹ بھرنے کے لیے ٹھہر جاتی تھیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کو اپنی سانس کی پھوار سے اوپر اچھال دیتی تھیں، جہاں وہ سمندری بگلوں کی لمبی چونچ کا شکار ہوجاتی تھیں۔ ادتیہ کو مچھلیاں کھانا پسند نہیں تھا۔ اس لیے وہ اپنے پتھر جیسے مضبوط انگوٹھوں سے دبا کر گھونگھوں اور سیپیوں کو کھالیتا تھا۔ ادتیہ اور ڈولفنیں کچھ کچھ دیر کے لیے نیند کی جھپکیاں بھی لے لیتی تھیں۔ ادتیہ اس وقت اپنا سر اور سینہ کی کی پیٹھ پر ٹِکا لیتا تھا۔ یہ لمبا سفر ٹھیک ٹھاک رہا۔ بس ایک واقعہ ہوا۔ ڈولفن اور ادتیہ ایک دن کھانا کھاکر آرام کررہے تھے کہ انھوں نے ایک موٹر بوٹ کے گھڑگھڑانے کی آواز سنی۔ کی نے چلا کر کہا ''یہ شکاری کشتی ہے۔ سب کے سب پانی کے اندر چلے جاؤ تاکہ کشتی آگے نکل جائے۔ سب مچھلیاں اور ادتیہ پانی کی گہرائی میں چلے گئے۔ ادتیہ نے کی سے پوچھا ''تمھیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ شکاری موٹر بوٹ ہے؟'' ''اس کی آواز سے۔ ہم ایک مرتبہ اس کے حملے کو جھیل چکے ہیں۔'' ''کیا کوئی ڈولفن بھی پکڑ لی گئی تھی؟'' ''نہیں! پکڑی تو نہیں گئی لیکن میں نے ''بادل دوست'' سے سنا ہے کہ ڈولفنیں، مچھلی پکڑنے والے جال میں پھنس چکی ہیں۔ ہم کو بہت دنوں میں یہ بات سمجھ میں آئی کہ ہمارے کچھ انسان بھائی ایسے بھی ہیں جو ہمیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ جاپان کے سمندر میں ایک مرتبہ مچھیروں نے ہزاروں ڈولفنوں کو مار ڈالا تھا، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ہم لوگ سمندری مچھلیوں کو کھاجاتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کو کافی شکار نہیں مل پاتا۔ دوسری طرف ڈولفنوں نے کشتی سے باہر کودنے کی کوشش نہیں کی، کیونکہ اس سے کشتی الٹ سکتی تھی اور مچھیرے مر بھی

سکتے تھے۔ ہم نے ان کی زندگی بچانے کے لیے خود کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔'' جتنی دیر میں کی نے یہ سب باتیں ادتیہ کو بتائیں۔ اتنی دیر میں شکاری موٹر بوٹ آگے نکل چکی تھی۔ ادتیہ کو انسان کی بے رحمی پر رونا آ گیا تھا۔ اس نے اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کی، لیکن وہ اس کی آنکھوں سے باہر آ کر سمندر کے کھارے پانی میں مل گئے۔ کی نے اس کی طرف پیار سے دیکھ کر تسلی دی اور کہا کہ مصیبت کا حال سن کر آنکھوں میں آنسو آ جانا فطری ہے، اس لیے ان سے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن یہ موقع بہرحال آنسوؤں کے نکلنے کا نہ تھا۔

ایک شام جب سورج سمندر میں ڈوبنے والا تھا اور آسمان کا رنگ نارنجی اور سمندر کی سطح سنہری ہو گئی تھی۔ کی نے اچانک اعلان کیا کہ ہم آسٹریلیا پہنچ گئے ہیں۔

ادتیہ نے پانی سے ذرا سا سر نکال کر دیکھا۔ سامنے زمین کا ایک بڑا ٹکڑا نظر آ رہا تھا جس کے کنارے ہرے بھرے درخت اُگے ہوئے تھے۔ ادتیہ نے اندر کی طرف نظر دوڑائی تو اسے سمندری پہاڑ نظر آیا جس کے آس پاس بہت سے جاندار موجود تھے۔ وہاں موٹی موٹی گائیں تھیں جو گھاس پر جھکی ہوئی تھیں۔ ایک خطرناک قسم کی بڑی مچھلی تھی جو آدمی کی ٹانگوں میں کاٹ لیتی تھی۔ پیلے رنگ کے سمندری سانپ تھے جو پانی میں ادھر ادھر تیر رہے تھے۔ رنگین مچھلیاں تھیں جو چٹان کے سوراخوں سے نکل کر گھونگھوں اور چڑیوں کو شکار کرنے کی تاک میں تھیں۔ ''یہ تمھارا اپنا کھوہ ہوگا۔''

سمندری پہاڑ کے ایک کھوہ کی طرف جاتے ہوئے کی نے ادتیہ سے کہا ''کیا تم یہاں رہنا پسند کرو گے؟''

''اچھی جگہ ہے'' ادتیہ نے کھوہ کے اندر فرش کو دیکھ کر کہا۔ ''رات میں یہ جگہ اور بھی اچھی ہو جاتی ہے۔ روشنی والی مچھلیاں اس غار کو بہت پسند کرتی ہیں'' ''روشنی والی مچھلیاں! کیا تمھارا مطلب کارڈینل مچھلیوں سے ہے؟''

''زمین پر کبھی کبھی رات میں چمکنے والے جگنو بالکل آسمان کے تاروں کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ اگر میں ''بادل دوست'' ہوتی تو میں بھی دنیا بھر کے عجائبات ضرور دیکھتی۔'' کی نے کہا ''لیکن تم نے ابھی تک ''بادل دوست'' کے بارے میں پوری بات نہیں بتائی۔'' ادتیہ نے کھوہ کے اندر آرام سے لیٹتے ہوئے کہا ''میں نے تم سے کہا تھا نا کہ یہ پانی کی مخلوق ہے اور پورے طور سے پانی سے ہی بنی ہے جب یہ تمھاری دنیا دیکھنا چاہتی ہے تو سمندر کی سطح سے بھاپ کی شکل میں اٹھ کر بادل میں تبدیل ہو جاتی ہے۔'' ''کیا وہ بھاپ بن کر ختم نہیں ہو جاتی؟''

کوئی چیز ختم نہیں ہوتی میرے دوست! کیونکہ ہر چیز اِنرجی ہے، جو اپنی شکل تو بدل لیتی ہے لیکن مرتی نہیں ہے۔ بھاپ بھی شکل بدل لیتی ہے لیکن صرف تھوڑی دیر کے لیے۔ پھر یہ بارش کے قطروں میں تبدیل ہو کر دوبارہ سمندر کے پانی میں آ کر مل جاتی ہے۔''

''تمھاری دنیا حقیقت میں، انسانوں کی دنیا سے زیادہ دل چسپ ہے۔ انسان بادل کو دیکھتے ہیں۔ اس کے تعلق سے اور تمام باتیں سوچتے ہیں۔ لیکن یہ سپنے میں بھی نہیں سوچ سکتے کہ بادل بھی جاندار مخلوق ہو سکتے ہیں۔ آسٹریلیا کے قدیم باشندوں کی طرح، کچھ لوگ یقین رکھتے ہیں کہ قدرت کی بنائی ہوئی ہر چیز جاندار ہے۔ یہاں تک کہ چٹانوں اور تالابوں میں

بھی جان ہوتی ہے۔ ہمارے لیے یہ بات بہت اہم ہے کہ ہر چیز اپنے وجود میں برابر کی حیثیت رکھتی ہے۔'' کی اپنے ریشمی بازوؤں کو ادتیہ کے بدن پر پیار سے پھیر کر بولی ''ادتیہ اب سو جاؤ اور پریشان مت ہو۔ میں صبح تم کو جگا دوں گی۔'' اتنا کہہ کر کی اپنے طاقت ور بازوؤں سے پانی کو چیرتی ہوئی آگے نکل گئی اور ادتیہ کے ''کھوہ گھر'' کو روشنی ڈالی مچھلیوں نے اجالے سے بھر دیا۔

سمندری ڈاکوؤں کا جہاز

ادتیہ اس وقت بھاپ کے بارے میں کوئی سپنا دیکھ رہا تھا جب کی نے اپنی تیز سیٹی کی آواز سے اس کو نیند سے جگا دیا۔

''ادتیہ! میرے ساتھ آؤ۔ پہاڑ کے دوسری طرف ایک ڈوبا ہوا جہاز پڑا ہے۔ میں اس کو تمھیں دکھانا چاہتی ہوں۔'' ادتیہ نے ہاتھوں کو پھیلا کر انگڑائی لی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''میں بھاپ کے بارے میں ایک سپنا دیکھ رہا تھا۔'' ادتیہ بدبدایا۔

''کیا وہ اصلی ڈاکوؤں کا جہاز ہے؟'' ادتیہ نے کی سے پوچھا۔ اب نیند اس کی آنکھوں سے غائب ہو چکی تھی ''میں ہمیشہ اس کو دیکھنے کی آرزو کرتا تھا۔ کیا اس کے اندر کوئی سمندری ڈاکو بھی موجود ہے؟'' کی نے قہقہہ لگایا۔ ''یہ جہاز سیکڑوں برس سے یہاں موجود ہے۔ تم اس کے اندر چند انسانی ڈھانچے ضرور دیکھو گے۔ میں تمھیں وہاں لے چلتی ہوں۔'' کی نے اپنے نتھنے کو ادتیہ کے سینے سے مل دیا اور ادتیہ نے ہنستے ہوئے اسے آگے دھکیل دیا۔ پھر وہ اس کے پیچھے پیچھے پہاڑ کے دوسری طرف کے راستے پر چل دیا۔ ایک بڑا سا جہاز ایک طرف کو پلٹا ہوا پڑا تھا اس کے بہت سے تختے ٹوٹ چکے تھے۔ اوپر عرشے سے ایک زنگ لگی ہوئی، توپ کا منہ دکھائی دے رہا تھا۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ادتیہ جہاز کے عرشے پر پہنچ گیا۔ اس نے جہاز کے کپتان کا کیبن دیکھا جس کی چھت ٹوٹ کر ایک طرف کو لٹکی ہوئی تھی۔ وہ کیبن کے اندر گھس گیا۔ ایک لالٹین اب بھی ٹوٹی ہوئی چھت کے نیچے، ایک کھونٹی سے لٹکی ہوئی تھی۔ ایک طرف ایک کرسی، میز اور ایک بستر پڑا تھا۔ ادتیہ نے فرنیچر کو الٹ پلٹ کر دیکھا کہ شاید اس کے اندر کوئی چیز چھپی ہو۔ پھر اس کی نظر لکڑی کے ایک صندوق پر پڑی جس کا تالا کھلا ہوا تھا۔ اس نے صندوق کو کھولنے کی کوشش کی لیکن اس کے اندر کوئی چیز اٹک رہی تھی۔ غور سے دیکھنے پر اسے ایک انسانی ہاتھ کا پنجر نظر آیا جس کا پنجہ اس طرح باہر نکلا ہوا تھا جیسے وہ کچھ مانگ رہا ہو۔ ادتیہ نے جھک کر صندوق کا ڈھکن اٹھا دیا۔ اس کے اندر سونے کے کچھ سکے تھے۔ سونے کا ایک لاکٹ تھا، جس میں بڑے بڑے موتی لگے ہوئے تھے۔ ایک نازک سا جواہرات سے جڑا ہوا کنگن تھا۔ چمڑے کا ایک پھٹا ہوا دستانہ تھا۔ کچھ بوتلیں تھیں جن میں مسالہ بھرا ہوا تھا۔ ایک خوب صورت تلوار تھی جس کے دستے میں ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ یہ تلوار سنہرے رنگ کی ایک میان کے اندر تھی۔ اس کے علاوہ سرخ ریشم کی ایک گٹھری تھی اور ایک پرانا قطب نما تھا۔ ادتیہ نے سب سے پہلے لاکٹ کو اٹھایا۔ اس کے اوپر ایک بہت حسین عورت کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ ایسی خوب صورت آنکھیں ادتیہ نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ اس نے لاکٹ کو کھولا تو اس کے اندر سنہرے بالوں کی لٹ رکھی ہوئی تھی۔

''میں یہ سب چیزیں یہاں سے نہیں لے جاؤں گا کیپٹن!'' یہ

کہتے ہوئے اس نے لاکٹ کو ہاتھ کے پنجر میں ڈال دیا۔ پھر ایک ایک کر کے اس نے تمام چیزوں کو غور سے دیکھا لیکن سب سے زیادہ پسند اس کو تلوار آئی اور اس کو اس نے اپنی کمر کے گرد بیلٹ سے لگا لیا۔ صندوق بھاری تھا اور ادتیہ کے لیے اس کو اکیلے لے جانا مشکل تھا۔ اس نے کی کو آواز دی اور وہ اٹھلاتی سیٹی بجاتی آ گئی۔

جب دونوں واپس کھوہ میں پہنچ گئے تو ادتیہ بولا ”میں نے ایک بہت قیمتی چیز جہاز میں چھوڑ دی ہے۔“

”وہ کیا؟“ کی نے صندوق کا دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا ”یہ ایک لاکٹ تھا جس پر ایک بہت خوب صورت عورت کی تصویر بنی ہوئی تھی اور اس کے اندر اس کے سنہرے بالوں کی ایک لٹ تھی۔ میں نے اس لاکٹ کو کیپٹن کے ہاتھوں میں دے دیا تھا کیونکہ شاید وہ اس سے بڑی محبت کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ اس طرح پھیلے تھے جیسے وہ اس لاکٹ کو اٹھانا چاہتا ہو مگر اس وقت جہاز کے تباہ ہونے کا حادثہ پیش آ گیا۔“ ادتیہ نے سرخ ریشم کے بنڈل کا ایک سرا کھینچا تو اس کے اندر سے کوئی چیز نیچے گری۔ یہ پیتل کا ایک چھوٹا سا ڈبہ تھا۔ ادتیہ نے تلوار کی نوک سے ڈبے کا ڈھکن کھولا مگر پھر فوراً ہی بند کر دیا۔ اس کے اندر کوئی کاغذ تھا۔ اس نے کی سے کہا ”چلو، اوپر چلیں۔ یہاں پانی میں اس کاغذ کی ساری لکھاوٹ ڈھل جائے گی۔“ اس کا کاغذ پہلے ہی سے کافی نم ہو چکا تھا۔ ادتیہ اوپر کی طرف جا کر ایک چٹان پر بیٹھ گیا اور کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر کو اونچی آواز سے پڑھنے لگا۔

”ہندوستان کے اس سرخ ریشم میں میری کرسٹینا بہت اچھی لگے گی۔ ہیرے کے مکٹ کو میرے آدمیوں نے کسی انگریز بہادر سے چھینا تھا۔ پانچ مہینے ہو گئے جب سے میں نے کرسٹینا کو نہیں دیکھا۔ مجھے گھر واپسی کی بڑی تمنا ہے۔ ہم نے کل ایک جہاز کو گھیر لیا تھا۔ ہم اس جہاز پر چڑھ گئے۔ ان کے پاس لڑائی کے ہتھیار نہیں تھے۔ انھوں نے ڈر کے مارے اپنا سب اسباب ہمارے حوالے کر دیا۔ ہم نے ان کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر رہا کر دیا۔ حالانکہ اس سے ہمارے آدمیوں میں کچھ بے چینی بھی پیدا ہو گئی تھی۔

ملاح کہتا ہے کہ ایک طوفان تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔ لیکن ہم پہلے بھی کئی طوفانوں کا مقابلہ کر چکے ہیں۔ اس لیے فکر کرنا بے کار ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں ایک ماہ کے اندر کرسٹینا کے پاس پہنچ جاؤں گا اور پھر ہم دسمبر کے مہینے میں شادی کر لیں گے۔ اس کے بعد میری سمندری ڈاکوؤں والی زندگی ختم ہو جائے گی۔ میں دوبارہ ایک باعزت شہری کی زندگی گزاروں گا۔ ڈاکوؤں کی زندگی تج دینے پر مجھے کوئی رنج نہ ہوگا۔“

آخری لائن کی تحریر اتنی خراب تھی کہ ادتیہ کو تین مرتبہ اسے پڑھنا پڑا، تب کہیں جا کر اس کا مطلب سمجھ میں آیا۔ لکھا تھا ”طوفان ہماری طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ ایسا بھیانک طوفان میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ کرسٹینا کا لاکٹ! مجھے اس کو پکڑ لینا چاہیے۔“

”تم نے ٹھیک ہی کیا ادتیہ! کرسٹینا کا لاکٹ کیپٹن کے ہاتھوں میں ہی رہنا چاہیے تھا۔“ کی نے کہا۔

جاری.......

■

ماخذ: اُدتیہ-سمندری لڑکا، مصنف: انیتا سرن
مصور: سُمیر رائے، مترجم: نامی انصاری
ناشران: (1) چلڈرن بک ٹرسٹ (2) قومی کونسل برائے فروغ اردو

طوبیہ حیات بنت شمشاد احمد

ہمارا پیارا ملک

ہمارا ہندوستان جنوبی ایشیا میں واقع ہے۔ آبادی کے لحاظ سے ہندوستان دنیا کا دوسرا سب سے بڑا ملک ہے۔ ماضی میں بھی ہمارے ملک کو ہندوستان کہا جاتا تھا۔

انڈس دریا یا دریا سندھ جو کہ پاکستان کا سب سے بڑا اور اہم دریا ہے۔ اس دریا کے نام پر ہی ہندوستاں کو انڈیا بھی کہا جاتا ہے۔

جب ہمارے ملک کو انگریزوں کی غلامی سے نجات ملی تب اس کا نام بھارت رکھ دیا گیا۔ تاریخی اعتبار سے بھارت کو کرما بھومی، تپو بھومی اور پنیا بھومی جیسے ناموں سے بھی جانا جاتا ہے۔

آج ہم اپنے ملک کو جس شکل میں دیکھتے ہیں۔ یہ صورت پانے میں ہمارے ملک کے باشندوں نے کس قدر محنت اور مشقت کی ہے۔

آیئے اب ہم آپ کو اپنے ہندوستان کی تاریخ کے بارے میں بتاتے ہیں۔

انیسویں صدی میں انگریزوں نے مغلوں کو اپنے ماتحت کر لیا اور اس طرح وہ ہندوستان کے حاکم بن گئے۔ 1857 کے غدر کے بعد حکومت کمپنی سے برطانوی تاج کے پاس چلی گئی۔ 1876 کے بعد سے برطانوی شاہان کو شہنشاہ ہندوستان کا عہدہ بھی مل گیا۔ ملک کو سنبھالنے کے لیے برطانوی حاکموں نے اپنی 'بانٹو اور راج کرو' پالیسی کو استعمال کیا۔

برطانوی پیداوار سستی اور مقامی پیداوار مہنگی کر کے مقامی صنعت کو نقصان پہنچایا گیا اور اس طرح ہندوستان سے پیسہ برطانیہ جاتا رہا۔ بھارت کی تحریک آزادی کا زیادہ تر زور نسلی امتیاز اور تابع تجارتی پالیسی کے خلاف تھا۔

برطانوی راج کے خلاف غیر تشدد پسند تحریک چلا کر موہن داس کرم چند گاندھی، مولانا محمد علی جوہر، جواہر لعل نہرو، سردار پٹیل، ابوالکلام آزاد، بال گنگا دھر تلک اور سبھاش چندر بوس کی قیادت میں بھارت نے 1947 میں برطانیہ سے آزادی حاصل کی۔ ہندوستان کی تقسیم ہو کر دو نئے ملک پاکستان اور بھارت بن گئے۔

یہ تھا ہمارے ملک ہندوستان کا قدیم سفر کہ کس طرح دیش کے سپوتوں نے ہمارے ملک کو آزاد کرایا۔

اپنی آزادی کے بعد سے، بھارت نے زیادہ تر ممالک کے ساتھ خوشگوار تعلق قائم رکھا ہے۔ 1950 کی دہائی میں، بھارت نے بھرپور طریقے سے افریقہ اور ایشیا میں یورپی ممالک سے آزادی کی حمایت کی اور غیر وابستہ تحریک میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ 1980 کی دہائی میں بھارت نے پڑوسی ممالک کی دعوت پر دو ممالک میں مختصر فوجی مداخلت کی۔ مالدیپ، سری لنکا اور دیگر ممالک میں آپریشن کے دوران بھارتی امن فوج بھیجی۔ جبکہ، بھارت کے پڑوسی ملک پاکستان کے ساتھ ایک کشیدہ تعلق شروع سے برقرار رہا اور دونوں ملک تین بار جنگوں (1965، 1971 اور 1999 میں) میں مدمقابل آئے۔ تنازع کشمیران جنگوں کی بڑی وجہ تھی۔

دیگر اہم معلومات:

بھارت سے متعلق کچھ ضروری باتیں:

1۔ وارانسی۔ دنیا کے قدیم ترین آباد مقامات {Inhabited places} میں سے ایک ہے۔

2۔ مہاراشٹر کی لونر جھیل۔ ایک الکا {Meteor} کی وجہ سے تشکیل ہوئی۔

3۔ ماؤسنرام- دنیا کا سب سے مرطوب {Humid} مقام ہے۔

4۔ ہندوستان انگریزی بولنے والا دوسرا سب سے بڑا ملک ہے۔

■

Tarbia Hayat Binte Shamshad Ahmad
Maunath Bhanjan (UP)

قاضی مسیرہ ناز نوید اقبال

اقوالِ زرّیں

(1) حسد جسم کو گلا دیتا ہے جب کہ قناعت بدن کو تازگی بخشتی ہے۔

(2) ضمیر کی عدالت دنیا کی سب سے بڑی عدالت ہے۔

(3) سچائی سے چہرے حسین ہو جاتے ہیں۔

(4) عقل اور دانش کا مقصد صداقت کی تلاش ہے۔

(5) محنت وہ کنجی ہے جو دولت کے تمام راستے کھول دیتی ہے۔

(6) ذہانت ایک ایسا انمول پودا ہے جو محنت کے بغیر نہیں پھلتا پھولتا۔

■

Qazi Museera Naaz Naved Iqbal
Qazi Mohalla, Sheepur
Shirpur - 425405 (Maharashtra)

قمرالدین معین الدین شیخ

سوچھ بھارت ابھیان

صاف ستھرا میرا من دیش میرا سندر ہو
پیار پھیلے سڑکوں پر کچرا ڈبے کے اندر ہو

سوچھ بھارت مہم کی شروعات حکومت کی طرف سے کی گئی جس کا خواب گاندھی جی نے دیکھا تھا۔ جس کے بارے میں گاندھی جی نے کہا تھا "صفائی آزادی سے زیادہ ضروری ہے" گاندھی جی اپنے وقت میں ملک کی غریبی اور گندگی سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس وجہ سے انھوں نے اپنے خواب کو پورا کرنے کے لیے کئی کوششیں کیں لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ بدقسمتی سے بھارت کی آزادی کے 67 سال بعد بھی ہم اس مقصد میں پیچھے ہیں۔ مہاتما گاندھی کی اس سوچ کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے حکومت ملک کے سبھی لوگوں کو اس مشن سے جوڑنے کی کوشش کر رہی ہے، جس سے یہ مشن کامیاب ہو سکے۔

اس مشن کو 2 اکتوبر 2014 سے شروع کیا گیا اور 2 اکتوبر 2019 (باپو کی 152 ویں سالگرہ) تک پورا کرنے کا مقصد رکھا گیا تھا۔ اس مشن کی پہلی سوچھتا مہم 25 ستمبر 2014 کو بھارت کے وزیر اعظم کے ذریعے شروع کی گئی تھی۔ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے بھارت کی اس مشن کی کارروائی لگاتار چلتی رہنی چاہیے اس کے لیے بھارت کے لوگوں میں صفائی کا احساس ہونا بے حد ضروری ہے۔

ملک کو صاف ستھرا اور ہرا بھرا بنانے کے لیے سوچھ بھارت مہم ایک اہم قدم ہے۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ "صفائی نصف ایمان ہے" ہم بھروسے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اگر بھارت کی عوام کے ذریعے عمل کیا گیا تو آنے والے چند سالوں میں سوچھ بھارت مہم سے پورا ملک ایک مثالی ملک بن جائے گا۔

■

Qamruddin Moinuddin Shaikh
Building No:8, Ghar No: 12, New Khowaja
Nagar Piprala, Jalgaon (Maharashtra)

آپ کا دماغ کتنا تیز ہے؟

دوستو! یہ دونوں تصویریں دیکھنے میں تو ایک جیسی لگتی ہیں لیکن تصویروں کی نقل بنانے والے سے ایک دو نہیں بلکہ دس غلطیاں ہوگئی ہیں۔ کیا آپ ان غلطیوں کو تلاش کر سکتے ہیں؟ 10 منٹ میں اگر آپ نے تمام غلطیاں تلاش کر لیں تو سمجھ لیں کہ واقعی آپ کا دماغ بہت تیز ہے۔

مجاهدالرحمن

پیاسی چڑیا

گرمی کا موسم تھا۔ اسکول کی چھٹیاں تھیں۔ حامد نے روزانہ کی طرح آج بھی اپنی امی سے باغ میں کھیلنے کی اجازت مانگی۔ امی نے یہ کہتے ہوئے اجازت دے دی کہ جلدی آجانا۔ حامد نے ہاں کہاں اور گھر سے باہر نکل گیا۔ حامد نے اپنے دوست ماجد اور ریحان کے گھر جاکر انھیں بلایا اور تینوں دوست مل کر باغ کی طرف جانے لگے۔ باغ میں کافی لوگ تھے۔ بوڑھے، جوان، بچے سبھی نظر آرہے تھے۔ بوڑھے ایک جگہ بیٹھتے ہوئے باتیں کررہے تھے۔ جوان لوگ چہل قدمی کرتے ہوئے نظر آرہے تھے اور بچے کھیل کود میں مصروف تھے۔ سبھی بچوں کی طرح حامد، ماجد اور ریحان بھی کھیل کود میں مصروف ہوگئے۔ کھیلتے کھیلتے اچانک حامد کی نظر ایک زمین پر تڑپتی ہوئی چڑیا پر پڑی۔ حامد دوڑتا ہوا چڑیا کے پاس آیا اور اسے ہاتھ میں اٹھالیا۔ یہ دیکھ کر ماجد ریحان بھی حامد کے پاس آگئے اور باغ میں موجود لوگ بھی حامد کی طرف دیکھنے لگے۔

حامد نے چڑیا کو دیکھا اس کو کوئی زخم نہیں آیا تھا۔ تب ہی ریحان نے کہا ”حامد شاید اسے پانی کی پیاس لگی ہے اور اسی لیے یہ تڑپ رہی ہے۔ یہ سن کر حامد نے ماجد کے پاس رکھی ہوئی پانی کی بوتل لی اور تھوڑا تھوڑا پانی چڑیا کو پلانے لگا۔ پانی پی کر چڑیا حامد کے پنجے پر اطمینان سے کھڑی ہوگئی اور دھیرے دھیرے چلتے ہوئے حامد کے کندھے تک آئی اور حامد کی طرف دیکھتے ہوئے چوں چوں کرنے لگی۔ حامد کو ایسا محسوس ہوا جیسے چڑیا اس کا شکریہ ادا کررہی ہو۔ چڑیا تھوڑی دیر تک حامد کے کندھے پر رہی اور اڑنے لگی۔

حامد، ماجد اور ریحان تینوں چڑیا کو اڑتا دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ باغ میں موجود لوگ جو یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے چڑیا کے اڑتے ہی حامد اور اس کے دوستوں کے لیے تالیاں بجائیں۔

پیارے بچو حامد، ماجد اور ریحان کی طرح ہمیں بھی ہر وقت ہر کسی کی مدد کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ یہ تعلیم ہمارے نبی حضرت محمدؐ نے ہمیں سکھائی ہے۔

■

Hafiz Mujahidur Rahman
S/o Abdul Wajid
Kaghzi Pura, Balapur
Distt:Akola- 444002 (Maharashtra)

روز مین الطاف مریم، درجہ ہشتم، ڈیڈ پی اردو اسکول، سبھاش نگر، مہاراشٹر

مسکان بی شیخ، درجہ ہشتم، الحسنات ہائی اسکول، مہاراشٹر

نصیرالدین شیخ شمس الدین
الحسنات اردو ہائی اسکول، رسلپور، مہاراشٹر

عرشیہ بی شیخ افضل، الحسنات اردو ہائی اسکول، رسلپور، تعلقہ، مہاراشٹر

نرگس پروین انور خان، درجہ ہشتم
ضلع پریشد اردو اسکول، نیم گاؤں، ناندورہ، بلڈانہ، مہاراشٹر

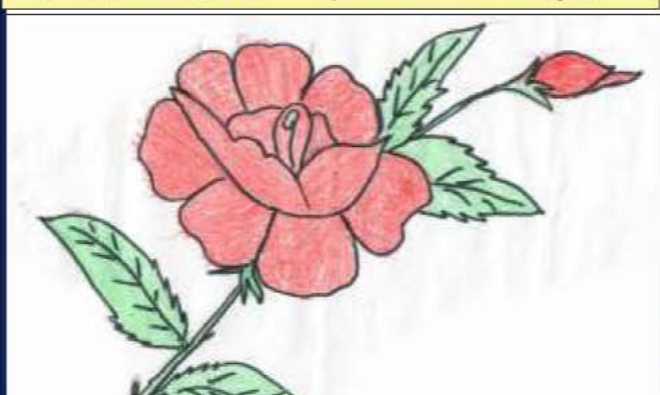

پریتی یادو، درجہ نہم، چودھری چرن سنگھ انٹر کالج، باٹنال، سدھارتھ نگر، یوپی

ننھے فنکار

محمد عرفان، درجہ چہارم، پرانی مسجد
مکتبہ اردو پرائمری اسکول، جگا تدل، مغربی بنگال

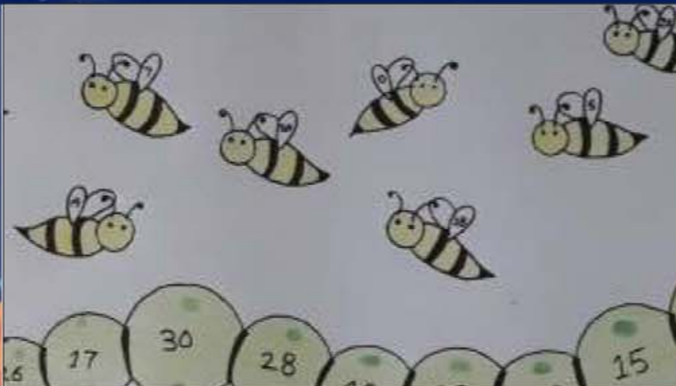

میمونہ، درجہ اوّل، آبان پبلک اسکول، مالیر کوٹلہ، پنجاب

محمد اظہر شیخ اسماعیل، گورنمنٹ اردو اسکول شاہ پور ضلع برہان پور شریف، ایم پی

بشرہ شمیم بنت شمیم احمد، درجہ ہفتم
سر اقبال پبلک اسکول، مئوناتھ بھنجن، یوپی

منیرہ ایمن، درجہ نہم، ہولی کراس اسکول، دربھنگہ، بہار

محمد زید ولد شمیم احمد، درجہ چہارم، سر اقبال پبلک اسکول، مئوناتھ بھنجن، یوپی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

عام لسانیات

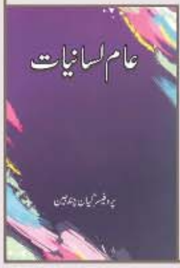

مصنف: پروفیسر گیان چند جین

تیسری طباعت: 2019

صفحات: 910

قیمت: 395 روپے

اردو ڈراموں کا انتخاب

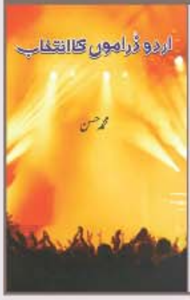

مرتب: محمد حسن

تیسری طباعت: 2019

صفحات: 600

قیمت: 265 روپے

قومی تہذیب کا مسئلہ

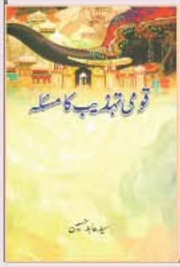

مصنف: سید عابد حسین

تیسری طباعت: 2019

صفحات: 220

قیمت: 120 روپے

اردو املا

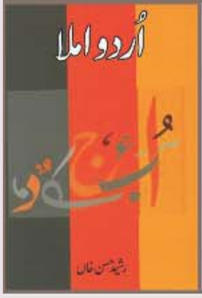

مصنف: رشید حسن خاں

پانچویں طباعت: 2019

صفحات: 706

قیمت: 240 روپے

کلیاتِ سراج

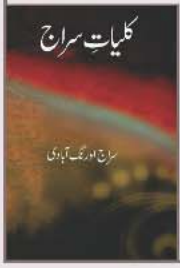

مصنف: سراج اورنگ آبادی

مرتب: عبدالقادر سروری

تیسری طباعت: 2019

صفحات: 732

قیمت: 320 روپے

تفہیمات وترجیحات

مصنف: شیخ عقیل احمد

صفحات: 237

قیمت: 130 روپے

اردو ادب میں مضمون کا ارتقا

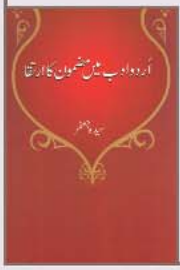

مصنف: سیدہ جعفر

اشاعت: 2019

صفحات: 558

قیمت: 225 روپے

INTRODUCTORY URDU VOL-I&II

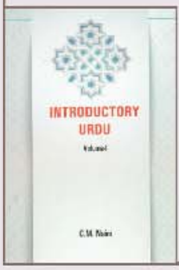

مصنف: سی ایم نعیم

پانچواں ایڈیشن: 2019

صفحات: 345 (جلد 1) 373 (جلد 2)

قیمت: 515 روپے (مکمل سیٹ)

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

BACHON KI DUNIYA Monthly, February 2020 Vol. 08, Issue: 02
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL(S) - 01/3439/2019-21
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/01/2020
Date of Dispatch: 12 and 13 of advance Month

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دلچسپ کتابیں

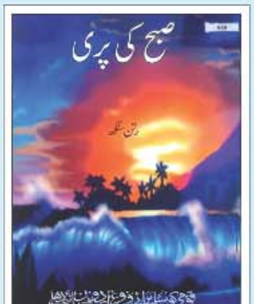

صفحات: 33، قیمت: 16 روپے

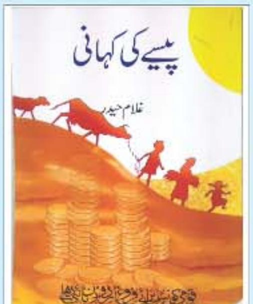

صفحات: 80، قیمت: 22 روپے

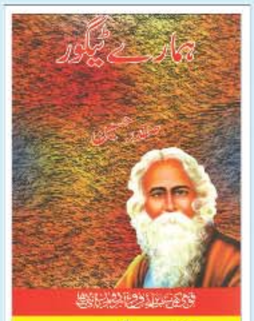

صفحات: 112، قیمت: 8 روپے

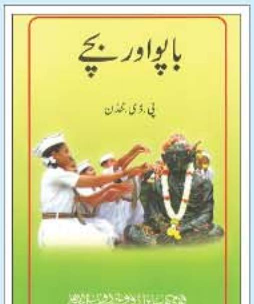

صفحات: 43، قیمت: 13 روپے

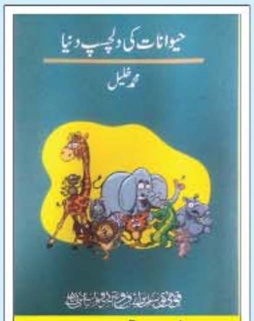

صفحات: 83، قیمت: 24 روپے

صفحات: 51، قیمت: 20 روپے

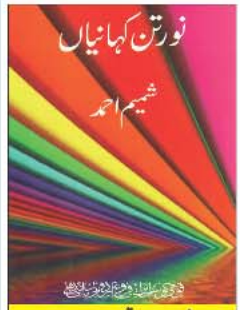

صفحات: 192، قیمت: 25 روپے

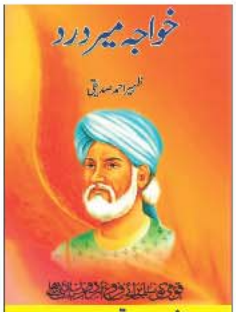

صفحات: 64، قیمت: 11 روپے

خریداری کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066-

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S. Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II, New Delhi - 110020